دین

کا متوازن تصوّر

عبادت اور خلافت کی جامعیت

اسلام کے تصور سیاست وحکومت، جہاد و احتساب،
نظریۂ خلافت ومقاومت کی کوششوں پر تنقید کے تناظر میں

ڈاکٹر مولانا محسن عثمانی ندوی
پروفیسر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی

مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

نام کتاب ———	دین کا متوازن تصور
تصنیف ———	ڈاکٹر مولانا محسن عثمانی ندوی
طباعت ———	تکمیل پرنٹنگ پریس۔ کراچی
اشاعت ———	سنہ ۱۹۹۹ء
ضخامت ———	۱۴۴ صفحات

ٹیلیفون

۶۲۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

باشتراک و تعاون
فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر۱ کراچی ۳۶

فہرست کتاب

مقدمہ کتاب — مولانا سید محمد رابع ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء

بابِ اوّل

دین کے متوازن تصور کے بارے میں نظریاتی، فکری اور تحقیقی مباحث

نمبر شمار		صفحہ	نمبر شمار		صفحہ
۱	دین اور سیاست کا رشتہ	۱۱	۶	عقلی دلیل	۴۰
۲	دین کامل	۱۲	۷	خلافت کا تصور	۴۲
۳	عبادت اور ریاست کا مجموعہ	۲۱	۸	اسلامی خلافت کا تسلسل	۴۸
۴	جہاد و احتساب	۳۰	۹	گزشتہ مباحث کا خلاصہ	۵۰
۵	نظریۂ احتساب ایک اسلامی نظریہ	۳۲			

بابِ دوم

تاریخ میں نفاذ دین کی کوششیں اور احتساب کے نمونے

نمبر شمار		صفحہ	نمبر شمار		صفحہ
۱	متوازن تصور دین کے نفاذ کی کوششیں	۵۹	۳	دینی طبقہ کی رائے عامہ	۶۴
			۴	عہد خلافت راشدہ کے بعد کی خرابیاں	۶۵
۲	یزید کی ولیعہدی کے نقصانات	۶۲	۵	اختلاف کی بنیاد	۶۸

نمبر شمار		صفحہ	نمبر شمار		صفحہ
۶	حضرت معاویہ کا موقف	۶۹	۱۲	حضرت عمرؓ کی حدیث	۸۶
۷	صحابۂ کرام کا روکنا بر بنائے شفقت ومصلحت	۷۰	۱۳	اسلام کا اصول حکمرانی	۹۰
			۱۴	آئینہ ہے رسوا تیرا	۹۶
۸	حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اہل عزیمت کے لئے نمونہ	۷۴	۱۵	عمر بن عبدالعزیز کی شہادت	۹۹
			۱۶	وضع الید فی الید کی روایت	۱۰۰
۹	ایک بنیادی مسئلہ اور علامہ ابن تیمیہ	۷۷	۱۷	وہ اسپرٹ آج بھی باقی ہے	۱۰۲
۱۰	علامہ ابن حزم کا موقف	۷۹	۱۸	مرض کے اسباب	۱۰۳
۱۱	امام غزالی، جصاص، امام الحرمین اور ابن حجر عسقلانی کا نقطۂ نظر	۸۲	۱۹	ائمہ دین کی کوششیں اور احتساب کے نمونے	۱۰۷

باب سوم

فہم دین کی راہ کی دشواریاں اور توازن کی تلاش اور دور جدید کی اسلامی کوششیں ۱۲۰

نمبر شمار		صفحہ	نمبر شمار		صفحہ
۱	راہ کی دشواریاں	۱۲۰	۶	خانقاہیں اور خانقاہوں کے مخالفین	۱۲۹
۲	دور جدید کی اسلامی کوششیں	۱۲۲	۷	تبلیغی جماعت	۱۳۱
۳	زمانہ حال کی تحریکات	۱۲۳	۸	جماعتوں کا سو فیصد متوازن ہونا دشوار ہے	۱۳۵
۴	عدم توازن کی ایک مثال	۱۲۵	۹	ایک خلا جسے پر کیا جانا چاہئے	۱۳۶
۵	جماعت اسلامی	۱۲۷	۱۰	تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز	۱۳۸

خاتمہ کتاب

کتاب کے بارے میں علماء اور دانشوروں کے تاثرات ۱۴۰

کوئی نام و پتہ پوچھے.....

پیدائش : ۲۸ر فروری ۱۹۴۷ء

وطن : گیا۔ بہار (وطن اقامت دہلی)

اسناد : عالمیت دارالعلوم ندوۃ العلماء، فضیلت دارالعلوم دیوبند، ایم اے پٹنہ یونیورسٹی، پی ایچ ڈی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

عہدہ ومنصب : حال ریڈر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی، سابق اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لال یونیورسٹی، سابق مترجم اناؤنسر نیوز ریڈر (عربی) آل انڈیا ریڈیو، سابق کسٹوڈن خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، صدر یونیورسل پیس فاؤنڈیشن دہلی، نائب صدر رابطہ ادب اسلامی (پٹنہ)، جنرل سکریٹری مجلس علمی دہلی۔

ادبی وعلمی صحافت : چیف ایڈیٹر سہ ماہی السلام دہلی، رکن ادارت سہ ماہی کاروان ادب لکھنؤ، سابق ایڈیٹر ماہنامہ دعوت وعزیمت دہلی، سابق نائب مدیر ماہنامہ ذکر وفکر دہلی۔

تصنیفات وتراجم : (۱) مصر کی عربی صحافت (۲) اسلام میں اہانت رسول کی سزا۔
(۳) حادثہ کربلا اور اس کا پس منظر (۴) دین وسیاست کا رشتہ۔
(۵) مسلمانوں کے مسائل کا حل۔ سورۂ یوسف کے مطالعہ کی روشنی میں۔
(۶) دین کا متوازن تصور۔ عبادت وخلافت کی جامعیت۔
(۷) مولانا وحید الدین خاں۔ علماء و دانشوروں کی نظر میں۔
(۸) نفح الطیب فی مدح الحبیب (اردو مترجم) (۹) قضیۃ البعث الاسلامی (عربی مترجم)
(۱۰) یافت ودریافت۔ ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ (زیر طبع)
(۱۱) سفرنامہ ترکی وشام (زیر طبع)

مقدمۂ کتاب

بقلم مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ العالی
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ"
اسلام کو صحیح انسانی زندگی کا مکمل اور واحد طریقہ کار بنایا گیا ہے چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظام حیات کو لیا جائیگا تو اللہ کے یہاں وہ نہ قبول کیا جائیگا اسلامی نظام حیات کو اپنی زندگی کیلئے اختیار کرنا ہر فرد کے لئے جو خدائے واحد کو مانتا ہے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ پھر اسلامی معاشرہ کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کے اختیار کئے جانے کے لئے ضروری حالات پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے صحابہ کرام کی عملی زندگیاں اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت اور اس سے قبل صحابہ کرام کی ایک تعداد کو حبشہ کی ہجرت کی اجازت یہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ ماحول اگر خراب ہو تو اس کے دباؤ سے مفاہمت نہیں کی جائے گی۔ اس طرح اگر کہیں مذہب پر یوں عمل کرنے سے روکا جا رہا ہو تو اس روک کو جدوجہد کے ذریعہ دور کرنا ہوگا اور اگر مجبوری ہو تو یہ جگہ چھوڑ کر دوسری سازگار فضا میں منتقل ہو جانا ضروری ہوگا۔ چنانچہ مسلمانوں نے رسول کریمؐ کے حسب ایماء مکہ کے ماحول کو اپنے دین پر عمل کرنے کے لئے ناسازگار پاتے پر حبشہ کی ہجرت کی پھر مدینہ منورہ کی ہجرت کی۔ مسلمانوں میں سے جو افراد حکم ہجرت پر عمل نہ کر سکے تھے اور اپنے کو مجبور سمجھ کر مکہ کے روک ٹوک کے ماحول کو گوارا کر رہے تھے ان کو قرآن مجید میں سخت الفاظ سے یاد کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہوئے ان سے ان کی تقصیر پر سوال کریں گے اور جب وہ جواب میں یہ کہیں گے " کُنَّا

مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ" کہ ہم اس علاقہ میں کمزور بنا کر رہنے دیئے گئے تھے تو فرشتے کہیں گے کہ کیا اللہ کی زمین اتنی وسیع نہ تھی کہ تم یہ تنگی کی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جاتے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں اس وسعت کے ساتھ عمل کرنا ضروری ہے جو وسعت اسکے لئے طے کی گئی ہے ورنہ تنگی کے ساتھ اور ماحول کے اعتبار سے کم وبیش کر کے دین پر عمل کرنا اور اس کم وبیش پر راضی رہنا صحیح نہیں۔ ہجرت کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حالات سے مفاہمت کر کے دین پر وہاں کے دائرہ میں محدود ہو کر عمل کرنا شریعت اسلامی میں بالکل قابل قبول نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اطراف عرب کے وفود جب مدینہ منورہ آنے لگے تو بعض امراء وفد نے دین کے بعض احکام سے مستثنیٰ کئے جانے کی شرط پر اسلام لانے کی پیشکش کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیش کش کو مسترد فرما دیا اور پورے دین کو اختیار کرنے کو ضروری قرار دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر متعدد قبائل عرب نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اس پر حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جہاد کا ارادہ فرمالیا اور جب حضرات صحابہ نے صورت حال کی نزاکت اور اہل اسلام کی فوری طور پر بہت کمزور پوزیشن میں آجانے کا حوالہ دے کر دشواری بیان کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ تاریخی جملہ فرمایا "أينقص الدين وأنا حيٌّ" کہ کیا ہو سکتا ہے کہ میرے جیتے جی دین کے کسی جز میں کمی کر دی جائے۔ اور انہوں نے اس دین کو مکمل طور پر ماننے اور عمل کرنے کے لئے مسلمانوں کو جہاد پر بھیجا اور جو قبائل زکوٰۃ کے عمل سے اپنے کو مستثنیٰ کر رہے تھے ان کو مرتد قرار دے کر ان سے جہاد کیا اور مکمل دین کو ماننے کی طرف سب کو واپس لے آئے۔

اسلام کی یہ خصوصیت اس کی پوری تاریخ میں قائم رہی ہے۔ مختلف صدیوں میں مختلف اصحاب عزیمت و مصلحین و مجددین اپنے اپنے زمانہ کے انحراف اور دین میں قطع وبرید کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں اور اسلام کو اس کے پورے چوکھٹے میں رکھنے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ اسی کی برکت ہے کہ آج اسلام باوجود اس کے ماننے والوں میں سے بہت سے افراد کی عملی کمزوریوں کے باقی اور قائم ہے، اس کا کوئی جز ختم نہیں ہوا ہے، اور نہ کیا جا سکا ہے، عقائد ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا اخلاق و آداب، دعوت و اصلاح ہو یا جہاد اس کے سب اجزاء نہ صرف یہ کہ تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کو مانا جاتا ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک پر عمل کے نمونے

جگہ جگہ نظر بھی آتے رہتے ہیں اور اسلام کی پوری تاریخ اس جدو جہد اور جہاد سے بھری ہوئی ہے۔

اسلام کے دشمنوں نے اسلام کو مختلف زمانوں میں کمزور کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ اس کو ناقص بنانے اور اس کے اجزاء میں کتر بیونت پیدا کرنے کے لئے کوششیں کی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ناکام ہوتے رہے ہیں کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کیلئے ہمیشہ طاقتور جدوجہد کرنے والے پیدا فرمائے اور وہ دین کو اس کی مکمل شکل میں باقی رکھنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے کیونکہ دین مکمل اور آخری دین کی صورت میں آیا ہے اور اس کو قیامت تک اسی طرح مکمل طریقہ سے باقی رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اعلان فرمادیا ہے کہ " الیوم اکملتُ لکمُ دینکم واتممْتُ علیکم نعمتی و رضیتُ لکم الاسلام دینا "۔ دین کو مکمل کردینے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کو مکمل کرنے سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ بھی فرمادیا ہے کہ تمہارے لئے اسی اسلام کو بحیثیت دین کے منظور اور پسند فرمایا ہے چنانچہ مسلمانوں کو یہ حقیقت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً ان کو ایسے فتنوں کا سامنا کرنا پڑتا رہے گا جو حالات اور زمانہ کے دباؤ سے دین کے بعض اجزاء کو غیر ضروری قرار دیکر ناقص دین پر اکتفا کر لینے کو کافی قرار دیں گے اور اسکے مطابق ذہن بنانے کی کوشش کریں گے۔ مسلمانوں کے اہل علم کا فرض ہے کہ ایسے موقع پر ان فتنوں کا مقابلہ اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں سے کریں۔

انگریزوں کے اقتدار کے زمانے میں جہاد کو غیر ضروری قرار دینے کا فتنہ اٹھا تھا اسی طرح ملک کی غیر مسلم اکثریت کے رسوم ورواج کے دھارے کے دباؤ میں آکر دین کے بعض شعائر اور لوازم کو غیر ضروری قرار دینے کی باتیں بھی اپنائی گئی تھیں اور ان آراء اور نظریات میں بعض علماء بھی دھوکہ کھاکر شریک ہوگئے تھے لیکن اہل حق علماء نے جب بھی ضرورت پڑی ان غلط رجحانات کے خلاف آواز اٹھائی اور مقابلہ کیا اور دین کو اس کی مکمل شکل میں دکھانے کی جدوجہد کی۔ اسوقت بھی دین کو اسکی مکمل شکل سے ہٹاکر پیش کرنے کی کوششیں وقتاً فوقتاً ہوتی نظر آتی ہیں اور ان کو بعض شخصیتوں کے قلم وزبان کی مدد بھی مل جاتی ہے لہٰذا اہل حق پر اس طرف نظر رکھنے کی اور حسب ضرورت ایسے غلط رجحانات کی اصلاح کی طرف توجہ دینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بعض غلط رجحانات کی طرف توجہ

دلانے کی ایک اچھی کوشش کی اور دین اسلام کے جامع اور کامل دین ہونے کی خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس سلسلہ میں بعض غلط رجحانات کی نشاندہی کی جو بعض اہل قلم کی تحریروں میں قارئین کے سامنے آرہے ہیں۔

بعض علمائے دین نے اس کتاب کے بارے میں اپنے اچھے تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے علمائے دین کی اس وضاحت سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

میں دعاگو ہوں کہ ان کی اس کوشش سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو اور اس پر بارگاہِ رب العزت سے اجر جزیل حاصل ہو۔ آمین

بَابِ اوّلُ

تصوّرِ دین کے نظریاتی، فکری اور تحقیقی مباحث

دین کا متوازن تصور

عبادت اور خلافت کی جامعیت

دین اور سیاست کا رشتہ :

" اسلام کامل سپردگی کا نام ہے نہ کہ کامل نظام کا "

" اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع "

یہ الفاظ ایک مخصوص تصوّرِ دین اور ذہن کی ایک خاص تراش وخراش کے بعد ہی زبان قلم پر آسکتے ہیں۔ اس مخصوص تصوّرِ دین کا حامل شخص جب اسلام کے اجتماعی احکام کا تذکرہ کرے گا وہ لکھے گا کہ یہ دین کا اضافی جز وہیں نہ کہ حقیقی ۔ وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے بارے میں قلم اٹھائے گا تو لکھے گا کہ یہ اقتدار وحکومت دین نہیں ہے بلکہ تاریخ ہے جو اتفاقاً وجود میں آگئی ہے جسے لوگوں نے دین سمجھ کر مقدس بنالیا ہے۔ غاصب حکمرانوں کے خلاف استخلاصِ وطن کی جد وجہد کرنے والوں کا ذکر وہ کرے گا تو ان کی تمام قربانیوں کو "خسر الدنیا والآخرہ" کا مصداق ٹھہرائے گا۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کی تحریکوں کے بارے میں اس کا تبصرہ یہ ہوگا کہ اسلام کو ان سے بے پناہ نقصانات پہونچے ہیں۔ دین کی سربلندی اور مسلمانوں کو غالب کرنے کی راہ میں کام آنے والے نفوس قدسیہ کے بارے میں وہ تمسخر آمیز انداز میں تحریر کرے گا کہ وہ شہادت کا ٹائیٹل لے کر عالیشان قبروں میں لیٹ گئے، جب وہ جہاد کا تذکرہ کرے گا تو استخفاف کا مرتکب ہوگا اور دور شمشیر اور جہاد بالسیف کے خاتمہ کا اعلان کرے گا۔

یہ غلطی دین وسیاست کے رشتہ نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ دین وسیاست کا رشتہ بے حد نازک رشتہ ہے اور اس رشتہ کو بیان کرنا پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ کسی ایک پہلو پر ضرورت سے کم یا ضرورت سے زیادہ ترکیز آسمانی دین کی غلط تشریح تک پہونچا دیتی ہے۔ قرن اول کا زمانہ دین کی منطقیانہ تشریح سے خالی تھا۔

وہاں عمل تھا عبادات کا اہتمام تھا اور میدانِ کارزار میں جہاد بھی تھا۔ لیکن وہاں کوئی شخص یہ کہتا ہوا نظر نہیں آتا تھا کہ جو میں کر رہا ہوں یا کہہ رہا ہوں صرف وہی دین ہے اور باقی سب غیر دین۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اسے خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔ عبادت اور بندگی کے کچھ داخلی تقاضے ہیں اور کچھ خارجی تقاضے ہیں۔ تزکیہ نفس اور ایمان کے اعلیٰ درجات کا حصول داخلی تقاضوں سے متعلق ہے اور اجتماعی نظام کی اصلاح کا تعلق خارجی تقاضے سے ہے۔ ان دونوں تقاضوں کے درمیان عمل کی سطح پر خوش گوار امتزاج پیدا کرنا اور اس توازن کو برقرار رکھنا دین میں بصیرت کی علامت ہے۔ خارجی تقاضوں کو نظرانداز کرنے سے وہ نہالِ آرزو بے برگ و بے ثمر ہو جائے گا جس کی آبیاری مجاہدین اور شہداء اپنے خونِ جگر سے کرتے آئے ہیں اور جن کی وجہ سے دین اور مسلمانوں کو غلبہ ہوتا ہے اور اعداءِ دین کو ہزیمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے؛ — داخلی تقاضوں کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ دوسرا ہوگا اور وہ یہ کہ خوفِ خدا سے دوری پر تزکیہ نفس سے غفلت اور اس کے نتیجہ میں احکامِ الٰہی کے نافرمانی کا ماحول پیدا ہو جائے گا۔ البتہ حالات کے تحت دائرہ عمل کی ترجیحات کو مرتب کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ میدانِ عمل کی اپنی ترجیحات کو منزل من اللہ نہ سمجھا جائے اور ذہنوں میں عبادت کے داخلی اور خارجی تقاضوں کا احترام موجود رہے۔

دین کامل

"اسلام ایک مکمل نظام ہے" یہ تعبیر صرف الفاظ کے اعتبار سے نئی ہے لیکن اپنی روح اور حقیقت کے اعتبار سے بہت پرانی ہے۔ دین و شریعت کے ماہرین ہمیشہ سے اسلام کی حقیقت نظام کے ہم معنی الفاظ میں بیان کرتے رہے ہیں۔ لغت میں نظام اس دھاگے کو کہتے ہیں جس میں موتی پر و دئے جاتے ہیں۔ اسلام کو نظام اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ عقائد عبادات اخلاق و عادات اور احکام و قوانین کا مجموعہ ہے۔ یعنی اس ایک دھاگے میں سارے موتی پر و دئے گئے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ربعی بن عامر سردارانِ فارس کے دربار میں اسلام کے سفیر بن کر گئے تھے وہاں کے سیاسی استبدادی نظام، وہاں کی اباحیت پسندانہ تہذیب اور ظالمانہ قوانین کے پس منظر میں انھوں نے اسلام کا جن الفاظ میں تعارف کرایا وہ تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

فقالوا له ماجاء بكم؟ فقال الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الى عبادة الله ومن ضيق الدنيا الى سعتها ومن جور الاديان الى عدل الاسلام	اہلِ دربار نے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کس لئے آئے ہو؟ ربعی بن عامر نے جواب دیا اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ جسے وہ چاہے اس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرے دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف لائیں

فارسلنا بدینہ الی خلقہ لندعوھم الیہ ۔

پس اللہ نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس طرف بلائیں ۔ اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کی عدل کی طرف لائیں ۔ اور

(البدایۃ والنہایۃ)

جامع نظام کی اصطلاح اس دور میں رائج نہیں ہوئی تھی ۔ لیکن کون اس بات سے انکار کرسکتا ہے کہ اس دعوت دین میں جو فارس کے دربار میں پیش کی گئی تھی ، اسلام کو بحیثیت نظام کے نہیں پیش کیا گیا ۔ " من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ " سے مطلق العنان اور استبدادی نظام حکومت و سیاست سے نجات دلانا بھی مراد ہے ۔ " ومن ضیق الدنیا الی سعتھا " میں اسلام کی جہاں گیری اور وسعت و آفاقیت کا ذکر ہے ۔ " ومن جور الدنیا الی عدل الاسلام " سے اسلام کے عادلانہ قوانین کی طرف اشارہ ہے ۔

امام ابن تیمیہ نے دین کی تعریف " الدین ماشرعہ اللہ " کے الفاظ میں کی ہے (السیاسۃ الشرعیہ صفحہ ۵) پھر شریعت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں ۔

التحقیق ان الشریعۃ التی بعث بھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم جامع لمصالح الدنیا والأخرۃ ۔

حق یہ ہے کہ وہ شریعت جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے دنیا و آخرت کے تمام فائدوں کی جامع ہے ۔

(الحسبۃ فی الاسلام صفحہ ۵)

علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ شریعت کا مقصد انسان کو معاش و معاد (دنیا اور آخرت) دونوں میں سہولت پہونچانا ہے ۔

کیا ان عبارتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے جس میں دنیا و آخرت کی نعمتیں جمع کر دی گئی ہیں ۔ ایک ایسے نظام میں جو رہتی دنیا تک کے لئے ہو جو لچک ہونی چاہئے وہ بھی اسلامی نظام میں موجود ہے ۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ فرمانرواؤں کے جاری کردہ سیاسی قوانین بھی صحیح ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مخالف نہ ہوں ۔ البتہ ان قوانین کے جو اجزاء شریعت سے ٹکرائیں گے وہ باطل ہیں (مجموع الفتاوی صفحہ ۱۹)

تنہا علامہ ابن تیمیہ نہیں بلکہ دیگر قدیم علماء نے بھی دین کی جو تعریف کی ہے اس میں لفظ " نظام " اگرچہ

موجود نہیں ہے لیکن اس تعریف پر نظام کا لفظ پورے طور پر منطبق ہوتا ہے۔ امام شاطبی نے دین کو تین حصوں میں منقسم کیا ۱۔ عبادات ۲۔ معاملات ۳۔ جنایات یہ تقسیم خود بتاتی ہے کہ دین ایک جامع نظام کا نام ہے جو انسان کی روحانی و تمدنی دونوں حیثیتوں پر محیط ہے۔ بعض فقہار شافعیہ نے بھی امور دین کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ وہ یا تو آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور اگر وہ دنیا سے متعلق ہوں گے تو پھر ان کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ معاملات ۲۔ مناکحات ۳۔ عقوبات۔ (کشاف اصطلاحات الفنون جلد ۱ صفحہ ۳۲)

فقہار احناف میں سے علامہ ابن النجیم (۹۲۶۔ ۹۷۰) نے اپنی کتاب البحرالرائق میں امور دینی کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ۱۔ اعتقادات ۲۔ عبادات ۳۔ معاملات ۴۔ مزاجر ۵۔ آداب۔ اس کے بعد انھوں نے معاملات کو بھی پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ معاوضات مالیہ (بیع و شرار وغیرہ) ۲۔ مناکحات (نکاح وطلاق وغیرہ) ۳۔ مخاصمات (مقدمات و فصل خصومات) ۴۔ امانات ۵۔ ترکات و وراثت

پھر اس کے بعد انھوں نے مزاجر کی یعنی جن کاموں میں شریعت نے زجر کیا ہے پانچ قسمیں کی ہیں۔ ۱۔ قتل نفس پر زجر ۲۔ مال غصب کر لینے پر زجر ۳۔ آبرو ریزی پر زجر ۴۔ پردہ دری پر زجر ۵۔ قطع بیضار پر زجر یعنی اسلام کی بیخ کنی۔ اسلامی حکومت کے خلاف سازش یا دین سے انحراف و ارتداد پر سزائیں۔

جو دین ان تفصیلات کا جامع ہو اس کو نظام قرار دینے والے دین کی تحریف نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے برعکس دین کے نظام ہونے سے انکار کرنے والے دین کی معنوی تحریف کے درپے ہیں۔

علمار امت نے دین کی جو تشریحات کی ہیں وہ قرآن و حدیث کے احکام کی روشنی میں کی ہیں۔ قرآن میں ایسی آیتیں ہیں جن سے عدل وقسط اور رفع ظلم کی کوششوں کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ ان آیتوں کی موجودگی میں دین کو صرف عقیدہ یا عبادت تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل	بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانت اس کے مستحقین کو ادا کرو۔ اور جب تم لوگوں کے درمیان میں فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

(سورہ نسار - ۸)

ان اللہ یحب المقسطین (سورہ نسار - ۸) بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

واللہ لا یحب الظالمین (آل عمران - ۱۴) اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

سورہ حدید میں خاک دان ارضی پر جو انسان کی قیام گاہ ہے قیام عدل کے تین طریقے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس

البتہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو نشانیاں لے کر اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ قائم رہیں عدل پر اور ہم نے نازل کیا لوہا اس میں بڑی طاقت ہے اور بے شمار فائدے ہیں انسانوں کے لئے۔

(سورہ حدید ۳)

اس آیت میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ اس دنیا میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور ان تین چیزوں کے مجموعے کو اگر کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ اسلامی نظام ہے۔ وہ تین چیزیں حسب ذیل ہیں۔

۱- کتاب یعنی ہدایت الٰہی کا مجموعہ (وانزلنا معھم الکتاب)

۲- میزان یعنی عادلانہ قوانین اور شریعت کاملہ (والمیزان)

۳- حدید لوہا تلوار کی طاقت یعنی قوت نافذہ جو کتاب اور میزان کے ماننے پر گردنوں کو جھکا دیتی ہے۔

بہ الفاظ دیگر عقائد و عبادات کے ساتھ قوانین شریعت اور پھر وہ قوت نافذہ جس کے زور سے لیقوم الناس بالقسط کا مقصد پورا ہوتا ہے بندگان خدا کے لئے وہ عظیم نعمت ہے جو خدا نازل فرماتا ہے۔ میزان کا بامعنی اور بلیغ لفظ قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثال کے طور پر

اللہ الذی انزل الکتب بالحق والمیزان (شوریٰ - ۲) اللہ ہی کی وہ ذات ہے جس نے کتاب نازل کی حق کے ساتھ اور میزان۔

والسماء رفعھا ووضع المیزان (رحمان) اور آسمان اٹھایا اس کو اور رکھی میزان

دین کی صرف یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے یا خدا کی بڑائی کا نفسیاتی سطح پر اعتراف ہے۔ یا اپنی بندگی کا حیاتی مظہر ہے۔ یہ چیزیں دین کے تین مختلف پہلوؤں

میں سے صرف ایک پہلو کو شامل ہیں۔ یہ کل دین نہیں۔ دین انسان کے تین پہلوؤں پر محیط ہے۔

۱۔ بندے کا خدا سے تعلق

۲۔ بندے کا اپنی ذات سے تعلق

۳۔ بندے کا دیگر بنی نوع انسان اور مخلوقات سے تعلق

دین کے ان تین پہلوؤں کو جب توازن اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا تو نظام کا تصوّر ضرور ابھرے گا۔ فساد کا منبع اور سرچشمہ یہ بات ہے کہ صرف ایک پہلو پر ترکیز اس قدر زیادہ ہو کر دوسرے تمام پہلو نہ صرف یہ کہ نظروں سے اوجھل ہو جائیں بلکہ ان کا انکار بھی شروع ہو جائے۔ یہ نظام کائنات قسط پر قائم ہے۔ اس لئے انسان کے تمام معاملات، کا بھی قسط پر قائم ہونا ضروری ہے اور انسانی تعلقات کے گوناگوں پہلوؤں کو اسی عدل و قسط پر قائم ہونا ضروری ہے۔ یہی اسلام کی انفرادیت ہے۔ یہ تسبیح و مناجات کے ساتھ سیاسی شوکت اور اجتماعی قوت کا ضامن ہے اور اسی لئے اقبال نے کہا ہے ؎

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش

جس نبوت میں نہ ہو قوت و شوکت کا پیام

اقبال کا یہ شعر محض ایک شعر نہیں بلکہ قرآن کریم کی چند آیتوں کا پرتو ہے۔

(۱) لِلّٰہِ العزۃُ ولِرسولہٖ وللمؤمنین (المنافقون ۸)

اللہ ہی کے لئے ہے غلبہ و عزت اور اس کے رسول کیلئے اور مومنین کیلئے۔

(۲) کَتَبَ اللہُ لاَغلبنّ انا ورُسلی انّ اللہَ قویٌ عزیز (المجادلہ ۲۱)

لکھ دیا اللہ نے کہ غالب ضرور آؤں گا میں اور میرے پیغمبر بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔

(۳) ولاتَہِنوا ولا تحزنُوا وانتم الاَعلَونَ اِن کُنتُم مُّؤمنین (آل عمران ۱۳۹)

ہراساں اور غم زدہ مت ہو تم ہی سربلند ہو گے اگر تم صاحب ایمان ہو۔

خدا کا دین عبادات اور خلافت دونوں کا مجموعہ ہے۔ خلافت کے تصور کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی دوئی کا شکار ہو جاتی ہے۔ حیاتِ انسانی کو خانوں میں بانٹنا پڑتا ہے۔ اور یہیں سے دین و دنیا کی تقسیم شروع ہو جاتی ہے حالانکہ انسانی زندگی ناقابل تقسیم وحدت ہے کیونکہ محبت و وفاداری اور فرمانبرداری کے تقاضے ناقابل تقسیم ہیں۔

یہ تقسیم تصور توحید کے بھی خلاف ہے - یہ کیسے ممکن ہے کہ عبادت گاہ کا خدا ایک ہو اور سیاستگاہ کا خدا دوسرا ہو - " قیصر کا حق قیصر کو دو اور خدا کا حق خدا کو " یہ تصور دو کشتیوں میں سوار ہونے کے مرادف ہے - اس تصور میں شرک کی آمیزش ہے - یہ سینٹ پال کا دیا ہوا تصور ہے جو اسلام کے تصور کے خلاف ہے - آج دنیا کی سوپر پاور کو اور اس کے زیر سایہ دوسری طاقتوں کو اگر اندیشہ ہے تو اسی دین سے ہے جو مذہب بھی ہے اور تہذیب بھی - جو عبادت بھی ہے اور شریعت بھی - جو انسان اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان بھی ہے اور بندوں کی بندگی سے آزادی کا اعلان بھی اور جس کی دعوت یہ ہے ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

عبادت کے صرف داخلی تقاضوں کو پورا کرنا اور تسبیح و مناجات میں مشغولیت کو کافی سمجھ لینا اور ملت کے اجتماعی مسائل سے روگردانی اور عبادت کے خارجی تقاضوں کو جن کا تعلق خاکدان ارضی پر احکام الٰہی کے نفاذ سے اور غلبۂ اسلام سے ہے بالکلیہ نظر انداز کر دینا اور ان کو اہمیت نہ دینا اور اس میدان میں کام کرنے والوں یا میدانِ کارزار میں جہاد کرنے والوں کے ساتھ تحقیر کا یا مخالفت کا برتاؤ کرنا دین کے متوازن تصور کے خلاف ہے -

ٹھیک اسی طرح سے عبادت کے داخلی تقاضوں کو پورا کرنے والوں اور اپنے پیدا کرنے والے اور کائنات کے مالک و خالق کے ساتھ مستحکم ربط و تعلق اور جدید مواصلات کی اصطلاح میں HOT-LINE رکھنے والوں اور سجدۂ قربت، دعوات عبدیت، نالۂ نیم شبی، جذبِ دل، سوزِ دروں، انابت و خشیت، تسبیح و تلاوت، عشقِ رسول، اخلاقِ نبوی کا تتبع اور سنتوں کے اہتمام کے اوصاف رکھنے والوں کے ساتھ استہزاء اور استخفاف کا معاملہ کرنا، اور ان کو ناقص دین کا حامل سمجھنا یا دین کے اس مغز و جوہر کو صرف جسم و پوست کا درجہ دینا اور اسے اسلامی حکومت کے لئے ذریعہ اور وسیلہ سمجھنا اختلال توازن کی دوسری مثال ہے کیونکہ عبادات کے داخلی تقاضے جوہر اور اصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلامی حکومت کا قیام اور دین کے قوانین عدل کا نفاذ اس کے لئے وسیلے کا درجہ رکھتے ہیں اس لئے وہ بھی مطلوب ہیں اور

وسیلے اور مقصد کا یہ فرق اس آیت سے بھی پورے طور پر واضح ہے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۝ (الحج ۴۱)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے۔

عبادات کے داخلی اور خارجی تقاضوں دونوں کو ہمیشہ نظر میں رکھنے اور اس توازن کو برقرار رکھنے سے دین کا صحیح اور جامع تصور پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے اور اس کا مقصد زندگی عبادت۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ارکان اربعہ میں لکھتے ہیں۔

"انسان اپنی ان مذکورہ بالا خصوصیات، اپنی برتری و شرف، اپنی عقل اور اپنے قلب کی وجہ سے دوسری مخلوقات کی بہ نسبت اس بات کا زیادہ حقدار تھا مسلسل عبادت میں رہتا اور اپنا ہر لمحہ رکوع و سجود، حمد و تسبیح اور ذکر الٰہی میں گذارتا اور کسی وقت بھی اس کی زبان اس کے ذکر سے غافل نہ ہوتی جو عطیات ربانی اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن انعامات کا اس کو مستحق بنایا گیا ہے جو بے شمار نعمتیں اس پر مینھ کی طرح برستی رہتی ہیں ان سب کا تقاضہ بلاشبہ یہی تھا کہ وہ عبادت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ترک نہ کرتا اور نماز سے پلک جھپکنے کے برابر غافل نہ ہوتا اور ان فرشتوں کی طرح ہو جاتا جن کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے۔

وَلَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَنْ عِندَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ۝ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ۝ (سورۃ انبیاء ۱۹، ۲۰)

اور اسی کی ملک ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ وہ تھکتے ہیں، رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں، موقوف نہیں کرتے۔

لیکن چونکہ اس کو اس زمین پر اللہ کا خلیفہ بننا تھا اور نہایت نازک منصب پر فائز ہونا

تھا اس لئے اس میں خواہشات بھی رکھی گئی ہیں اور کچھ ضرورتیں بھی اس کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہیں۔ اس میں جذبات بھی ہیں اور سوز محبت بھی، احساس الم بھی اور شعور مسرت بھی۔ ذوق جستجو اور شوق علم بھی۔ وہ زمین کے خزینوں اور دفینوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی پوری صلاحیت وقابلیت رکھتا ہے۔ تعلیم اسماء کی جو خصوصیت وامتیاز اس کو حاصل ہے وہ دراصل اس کی فطری استعداد کا رمز اور خلافت ارضی کا مظہر ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ٥ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ٥

(سورہ بقرہ ۳۰-۳۳)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائیگا درانحالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں (اللہ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اللہ نے آدم کو نام سکھلائے کل کے کل پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر فرمایا بتلاؤ تو ان کے نام اگر تم سچے ہو، وہ بولے تو پاک ذات ہے ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دے دیا۔ بیشک تو ہی ہے بڑا علم والا، حکمت والا (اللہ نے) فرمایا آدم بتلادو انہیں ان کے نام پھر جب

انہوں نے انہیں ان کے نام بتلا دئے
تو فرمایا۔ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں
آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا
ہوں اور جو کہ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ
تم چھپاتے ہو وہ سب جانتا ہوں۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ ۲۹)

وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔

قل من حرّم زينة الله التى اخرج لعباده و الطيبٰت من الرزق۔ (اعراف ۳۲)

آپ کہئے اللہ کی زینت کو جو اس کے اپنے بندوں کیلئے بنائی ہے کس نے حرام کردیا ہے اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو۔

اس اہم اور نازک منصب کی ذمہ داریوں کو نباہنے اور اس خاص مقصد کی تکمیل کے لئے اس کی تخلیق کی گئی۔ اس کو اجرام فلکی پہاڑوں نباتات جمادات اور حیوانات کی طرح مسلسل قیام مسلسل رکوع مسلسل سجود اور مسلسل تسبیح و ذکر کا پابند نہیں کیا گیا اور اگر وہ کبھی اس کی کوشش کرے گا تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ناکامی کا ثبوت فراہم کرے گا اور ان فرشتوں کے اعتراض کو حق بجانب ثابت کرے گا جنہوں نے اس کے بجائے اس بناء پر اپنی خدمات پیش کی تھیں اور اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھا تھا کہ وہ ہمیشہ تسبیح و تحمید اور ذکر و عبادت میں مشغول رہتے ہیں " ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك "

(ارکان اربعہ ۳۱-۳۲)

حضرت مولانا ندوی کی کتاب ارکان اربعہ خالص عبادات کے موضوع پر اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں جس کا موضوع عبادات ہے خلافت کے موضوع پر یہ تحریر دین کے متوازن تصور پہ روشنی ڈالتی ہے۔ اوپر کے اقتباس میں مولانا نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔
۲۔ چوں کہ وہ اللہ کا خلیفہ ہے اس لئے اس کے اندر ذوق علم، شوق جستجو اور زمین کے خزینوں اور دفینوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی صلاحیت بخشی گئی اور تعلیم اسمار کا امتیاز اسے عطا کیا گیا۔
۳۔ انسان مسلسل رکوع و سجود اور مسلسل تسبیح و ذکر کا پابند نہیں اگر وہ اس کی کوشش کرے گا تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ناکامی کا ثبوت فراہم کرے گا۔

عبادت اور ریاست کا مجموعہ

اسلام ایک جامع دین ہے اور اس کے جامع ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ عبادت و ریاست کا مجموعہ ہے اس مجموعہ میں مرکزی حیثیت یقیناً خدا کے ساتھ لگاؤ اور تعلق کو حاصل ہے اور وہ اصلاً مطلوب ہے۔ لیکن خدا کے ساتھ تعلق کی استواری اور پھر اس کے بعد خدا کے عادلانہ قوانین کے نفاذ کے لئے اختیار اور طاقت کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ اس کے لئے بھی سعی و کاوش ایک دینی ضرورت ہے۔ نہ حکومت کے بغیر زمین میں فتنہ و فساد کو دفع کیا جا سکتا ہے اور نہ اللہ کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و امان کا قیام ممکن ہے۔ ایک رسالہ کے مدیر اور معروف صاحب قلم کا یہ عقیدہ ہے کہ حکومت اللہ کی طرف سے صرف انعام ہے۔ اور قرآن میں اعمالِ صالحہ پر عزت و حکومت کی خوشخبری دی جا چکی ہے اس لئے جو چیز وعدۂ الٰہی کی حیثیت رکھتی ہو اس کے لئے سعی و جانفشانی کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ تصور ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں کا ظہور بھی عام طور پر اسباب کی سطح پر ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی انعام کا وعدہ فرماتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ وہ اسباب و تدابیر کے بغیر اس کو پورا کر دے گا۔ اگرچہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ لیکن یہ اس کی سنّت عادیہ کے خلاف ہے۔ اس عالم اسباب و تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے روزی و رزق کا وعدہ فرمایا ہے۔

وما من دابۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقہا — نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین پر مگر یہ کہ اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس نے حصول رزق کو طلب اور کوشش پر موقوف رکھا ہے۔ اور رزقِ حلال کے حصول کے لئے تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا ہے "وابتغوا من فضل اللہ" اور تلاش کرو اللہ کا فضل رزق میں سے۔ اسلام کی تاریخ جدید میں فقہاء محدثین مفسرین اور شارحین حدیث کی کمی نہیں۔ لیکن اسلامی علوم کی جامعیت اور سیرت نبوی اور تاریخ اسلام میں رسوخ وکمال کے اعتبار سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی سے بڑھ کر کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔ علامہ اس موضوع پر رقم طراز ہیں:

"اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی وجنت سماوی اور آسمانی بادشاہت اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے نہ کوئی کسریٰ۔ اس کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ وہی آسمان پر حکمراں ہے وہی زمین پر فرماں روا ہے۔" ھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ"

(سیرت النبی جلد ۷ صفحہ ۷)

اسلام کے تصور دین کی وضاحت میں توازن اکثر کھو گیا ہے۔ ایک معروف کتاب جو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں کی تشریح میں لکھی گئی ہے اس پر یہ تنقید ہے کہ اس میں اسلام کے سیاسی پہلو کو اس طرح سے اہمیت دی گئی ہے کہ اعتقادات وعبادات کو بھی اس کا تابع کر دیا گیا ہے دوسری طرف ایک صاحب قلم اس سیاسی تشریح سے لڑ کر ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے اس قسم کا دین پیش کیا ہے جس میں نہ جہاد ہے نہ احتساب نہ اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش اور نہ کوشش کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور تائید۔ اس موضوع پر مکمل اعتدال اور توازن علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس اقتباس کو غور سے پڑھئے:

"اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب تھے اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کرسکیں۔ اس لئے

وہ بھی عرضاً مطلوب ہے۔ (سیرت النبی جلد ۷، صفحہ ۶)

سید صاحب اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے۔ یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے"

(سیرۃ النبی جلد ۷، صفحہ ۵)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کی تاریخ سلطنت و مذہب کے اشتراک کی تاریخ ہے۔ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں مکی و مدنی دونوں زندگی جمع کر دی گئی تھی۔ آپ کی ذاتِ مبارک میں امامت و نبوت دونوں کو اس طرح ہم کر دیا گیا تھا کہ بقول علامہ سید سلیمان ندوی ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اسلام میں قتال و جہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور اس پر اخروی و دنیوی دونوں نعمتوں کے وعدے فرمائے گئے ہیں:

وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھو اجتباکم وماجعل علیکم فی الدین من حرج (الحج ـ ۱۸)	اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو اس کام کے لئے چن لیا اور تم پر دین کے دائرے میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔

قرآن میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت قرار دیا گیا ہے۔

للّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر	اے اللہ حکومتوں کے مالک تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے۔ تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے اور تیرے ہی قبضے میں ہر قسم کا خیر ہے۔

اس آیت میں عزت و ذلت سے مراد سلطنت کا ملنا اور سلطنت کا چھن جانا ہے۔ بلاغت اصطلاح میں اسے لف و نشر مرتب کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات میں نبوت و ہدایت کے بعد حکومت و سلطنت کا ذکر فرمایا ہے۔

فقد اتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمۃ واتینا ھم ملکاً عظیما۔ (نساء ـ ۸)	ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت اور نہایت بڑی حکومت بخشی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يا قوم اذكروا نعمة الله عليكم اذ جعل فيكم انبياء وجعلكم ملوكا (مائدہ - ۳)

اے میری قوم یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کہ اس نے تمھارے درمیان بہت سے نبی بھیجے اور تم میں سے بہتوں کو بادشاہ بنایا۔

اسی طرح اقتدار کا ختم ہوجانا اور محکومیت کی حالت میں زندگی گذارنا خدائی قہر کی علامت ہے۔ یہودیوں پر جب قہر الٰہی نازل ہوا تو وہ اقتدار سے بے دخل کر دئے گئے اور محکوم اور ذلیل ہوئے۔ یہ واقعہ دوبار پیش آیا۔ ایک بار بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں۔

وقضينا الى بني اسرائيل في الكتاب لتفسدن في الارض مرتين ولتعلن علوا كبيرا - فاذا جاء وعد اولاهما بعثنا عليكم عبادا لنا اولي بأس شديد فجاسوا خلال الديار وكان وعدا مفعولا ثم رددنا لكم الكرة عليهم وامددناكم باموال وبنين - وجعلناكم اكثر نفيرا - ان احسنتم احسنتم لانفسكم وان اسأتم فلها فاذا جاء وعد الآخرة ليسوء وجوهكم وليدخلوا المسجد كما دخلوه اول مرة وليتبروا ما علوا تتبيرا۔ (بنی اسرائیل - ۱)

اور ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب ان ہی سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تمھارے مقابلہ پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمھارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا اس کے بعد ہم نے تمھیں ان پر غلبہ کا موقع دیا اور تمھیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمھاری تعداد پہلے سے بڑھادی۔ دیکھو تم نے بھلائی کی تو وہ تمھارے اپنے ہی لئے اور برائی کی تو وہ تمھاری اپنی ذات کے لئے برائی ثابت ہوئی پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اس طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کرکے رکھدیں۔

ان الذين اتخذوا العجل سينالهم غضب من ربهم وذلة في الحياة الدنيا وكذلك نجزي المفترين

جن لوگوں نے گائے کے بچھڑے کو معبود بنالیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا میں ذلت نصیب ہوگی ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

اسلام وہ دین ہے جس کے پیغمبرؐ کو غلبہ اور حکمرانی کی نسبت خصوصی حاصل ہے۔ اور جس نے

فرمایا ہے۔

السلطان ظل اللہ فی الارض یاوی الیہ کل مظلوم من عباد اللہ	صالح حکمراں زمین پر اللہ کا سایہ ہے جس کے دامن میں بندگانِ الہٰی میں سے ہر مظلوم پناہ لیتا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں سلطان یعنی "سلطہ" سے مراد اقتدار و حکومت ہے، اسلامی سلطنت عام دنیوی سلطنتوں سے مزاج اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ دوسری سلطنتیں عیش و تنعم یا جہانگیری و کشورکشائی کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن اسلامی سلطنت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندگانِ خدا پر ظلم نہ ہو معروف کی اشاعت ہو اور منکر کی روک تھام ہو اور دنیا سے ظلم و ستم، فحش کاری و بدکاری کا خاتمہ ہو۔

کسی خطۂ زمین میں اسلام کے ماننے والے اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ اسلام کے اجتماعی قوانین کا نفاذ عمل میں لاسکیں تو ان کے لئے یہ کام بھی فرض ہو جاتا ہے کوئی اسلامی ریاست صرف مسلمانوں کے وجود سے نہیں بن جاتی۔ بلکہ احکام اسلامی کے نفاذ سے قائم ہوتی ہے۔ اور ایسی اسلامی ریاست کا قائم کرنا اس مسلم معاشرے کا فریضہ ہوگا جو قائم کرنے کی پوزیشن میں ہو اور عددی قوت رکھتے ہوئے اس کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ غیر اسلامی احکام پر عمل کرے۔

یاایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان. انہ لکم عدو مبین	اے ایمان والو حلقۂ اطاعت میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اور جو شخص غیر اسلامی نظام پر راضی ہو وہ گمراہ اور منحرف ہے

ماکان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لہم الخیرۃ من امرہم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔ (الاحزاب ـ ۳۶)	کسی مومن مرد یا عورت کو خدا اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد اپنے امر میں کوئی اختیار نہیں ہو سکتا۔ جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوا

شریعت کے قوانین کتابوں کی زینت بنے رہنے کے نہیں اور نہ ان کی حیثیت ضمنی اور اضافی قوانین کی ہے۔ اگر مسلمانوں کے کسی ملک میں اسلام کا عادلانہ نظام نافذ نہیں ہے تو اس کے لئے جد و جہد شروع ہے اس لئے کہ "بما انزل اللہ" کے خلاف جو قانون بھی نافذ ہوگا اس کا نفاذ جرم قرار پائے گا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الظالمون ۔ اور جس شخص نے بما انزل اللہ کے خلاف حکم جاری کیا تو وہی لوگ ظالم ہیں ۔

جب قرآن مسلم معاشرے کی رہنما کتاب ہے ۔ جب پیغمبرؐ کی زندگی کا نمونہ ہے اور جب خلفائے راشدین کی عادلانہ حکومت روشنی کا مینار ہے تو مسلم معاشرے کو سیاست و اقتدار سے لے کر معاملات و اخلاق تک اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہو جائے گا ۔ اقتدار کی زمام جن لوگوں کے پاس ہو وہ اگر اسلامی قوانین کو نافذ نہ کریں اور شریعت کو پس پشت ڈال دیں تو حسب ضرورت احتساب مزاحمت اور مقاومت کا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہو جائے گا اور اگر انقلابی کوششیں کامیاب ہو جائیں تو حکیمانہ طریقے سے شریعت کے قوانین کو ملک میں جاری کیا جائے گا ۔

اسلامی تاریخ میں شریعت کے رمز شناس ائمہ دین حنیف نے سیاست و حکومت کی سطح پر بھی اسلامی احکام و روایات سے انحراف گوارا نہیں کیا ۔ وہ اس کے لئے سینہ سپر ہو گئے ۔ موج خوں ان کے سر پر سے گذر گئی لیکن مداہنت انھوں نے برداشت نہیں کی ۔ انھوں نے مسلمانوں کا غیر اسلامی اقتدار برداشت کیا نہ غیر مسلموں کا غاصبانہ قبضہ ۔ امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے لے کر حضرت سید احمد شہید بریلوی تک جہاد و عزیمت کی مسلسل داستان ہے اور دور جدید کی بہت سی اسلامی تحریکیں بھی اس غیرتِ ایمانی کی وارث اور امین ہیں ۔

دین کا کامل نمونہ خلافت راشدہ تک باقی رہا ۔ اس دور تک دین ایک طرف داخلی سطح پر ایمانی کیفیات دوسری طرف خارجی سطح پر سیاسی اور اجتماعی تنظیم دونوں کا مجموعہ بنا رہا ۔ لیکن بعد کی صدیوں میں نظام کی یہ وحدت باقی نہیں رہی ۔ البتہ کچھ وقفے ایسے ملتے ہیں جس میں خلافت راشدہ کا نمونہ سامنے آجاتا ہے ۔ لیکن چونکہ ایک طویل عرصہ تک عبادات و اخلاق کی تعلیم و تربیت جن کے ہاتھوں میں رہی وہ اقتدار اور حکومت سے محروم رہے اور جو ارباب اقتدار تھے ان کی زندگی خدا ترسی عبادت اور روحانیت کا نمونہ نہ تھی اس لئے بہت سے ذہنوں میں دین اور دنیا کی جدائی کا تصور پیدا ہو گیا بلکہ کچھ لوگ قیام سلطنت کی کوششوں میں حصہ لینے کو دین کی خلاف ورزی سمجھنے لگے ۔ دین کے بارے میں انحراف یا اس تحریف کے تاریخی اور نفسیاتی اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی کہتے ہیں ۔

" ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیاء کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلایا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے جس سے

اہلِ علم اور اہلِ افکار کو کنارہ کش رہنا چاہیئے ۔"

(سیرت النبی ج ۷، ص ۱۴۲)

دین و سیاست کی تفریق کے موضوع پر مولانا علی میاں ندوی مدظلہ کا یہ بیان پڑھیئے:

"میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتادینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں جو دین و سیاست کی تفریق کے قائل ہیں، نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچے میں (خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو) فٹ ہو جائے اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے جو سیاست کو قرآن کے شجرۂ ملعونہ الشجرۃ الملعونۃ فی القرآن کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں کی صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا۔"

(بحوالہ نیا طوفان اور اس کا مقابلہ صفحہ نمبر ۳۲-۳۳ مطبع مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ)

دین میں سیاست اور روحانیت دونوں کی اہمیت ہے۔ سیاست اور سلطنت کو نظر انداز کر دینا یا اسلامی معاشرہ میں اسلام کے معاشی، سیاسی اور اجتماعی قوانین کے نفاذ کی کوششوں کا تمسخر اور استہزار غلط تصور دین کا حامل ہوتا ہے اور اس کج فکری کو مسلمانوں کے ذہنوں تک پھیلانا ایک محرّف دین کی طرف مسلمانوں کو بلانے کے مرادف ہے۔ علامہ ابن تیمیہ دین و سیاست کی وحدت کے قائل ہیں، جدائی کے نہیں وہ "السیاسۃ الشرعیۃ" میں لکھتے ہیں:

"جب کبھی دین و سیاست میں جدائی ہوتی ہے دو گروہ معرض وجود میں آتے ہیں ایک گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو دین دار تو ہوتے ہیں، لیکن قوتِ حرب، جاہ و مال سے جس کا دین خداوندی ضرورت مند ہوتا ہے دین کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ دوسرا گروہ

ایسے امراء وحکام پر مشتمل ہوتا ہے جو مال اور حربی قوت کو بروئے کار تو لاتے ہیں
لیکن اس سے ان کا مقصد دین کی اقامت نہیں ہوتا۔ دونوں گروہ اسلام کے لئے
بے کار ہیں۔"

امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الحسبۃ فی الاسلام کے مقدمے میں سلطنت اور حکومت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر لا یتم الا بالعقوبات الشرعیۃ فان اللہ یزع بالسلطان ما لا یزع بالقرآن

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام شرعی سزاؤں کے بغیر ناتمام رہتا ہے اللہ تعالیٰ اقتدار وسلطنت کے ذریعے وہ روک لگاتا ہے جو قرآن کے ذریعہ نہیں لگاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام زہد وعبادت کا بھی نام ہے اور حکومت وریاست کا بھی۔ اور اگر مسلمانوں کی آبادی میں شرعی اصولوں پر اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اس کی اصلاح کی کوشش بھی لازمی اور ضروری ہے تاکہ اجتماعی معاملات شرعی منہج پر قائم ہو سکیں۔ مسلمان کا عقیدہ یہی ہے کہ حاکمیت اللہ کو حاصل ہے اور انسان کی حیثیت اس زمین پر نائب اور خلیفہ کی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کے لئے مسلم معاشرہ میں اجتماعی ادارہ کا قیام ضروری ہے۔ اس اجتماعی ادارہ کو شرعی اصطلاح میں خلافت یا امامت کہتے ہیں اور جس کی دینی اور شرعی حیثیت مسلمہ ہے۔ مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ:

"اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ وامام ہونا چاہئے
خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان سربراہ اور صاحب حکومت ومملکت ہے جو
مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء ونفاذ کی پوری قدرت
رکھتا ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کے لئے پوری طرح طاقتور ہو۔"

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی ص۱۵)

آیت استخلاف کی تشریح میں مفسرین نے لکھا ہے کہ خلافت کے مفہوم میں دینی اور دنیاوی اور روحانی اور مادی دونوں قسم کی سیادت داخل ہے اور قوانین الٰہی کے نفاذ کے لئے ایک اسلامی حکومتی ادارہ کا قیام بھی ضروری ہے۔ حکومت وریاست کی یہی دینی حیثیت ہے جس کی وجہ سے صحابہ کرام جہاد وقتال اور حکومت کے تمام شعبوں کو عبادات اور اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے۔ اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ غلبہ اسلام کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے معاصی کے دفتر کو دھو دیتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ دین میں حکومت کا قیام مقصود بالذات نہیں ہے جن لوگوں نے دین کی تشریح اس انداز میں کی ہے کہ تمام پیغمبروں کو خدائی فوجدار بنا کر بھیجا گیا تھا اور ان کا مشن یہ تھا کہ وہ دوسروں سے اقتدار کی کنجیاں چھین لیں وہ تشریح کے معاملے میں عدم توازن کا شکار ہوئے ہیں۔ قرآن وسنت میں اس بات کی صراحت نہیں ملتی ہے۔ غور کیجئے تو اس میں حکمت کا پہلو ہے۔ اور بندوں پر اللہ کی خاص شفقت نظر آتی ہے۔ اگر اس کی صراحت کر دی جاتی تو کسی ملک میں دو مسلمان بھی پائے جاتے تو حکومت کا قیام ان پر فرض ہو جاتا اور ان کے لئے یہ کام ضروری ہو جاتا خواہ اس کے لئے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

اسی طرح سے وہ لوگ بھی عدم توازن کا شکار ہوئے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف بشیر ونذیر بنا کر بھیجے گئے تھے اس لئے مسلمانوں کے لئے حکومت قائم کرنے کی کوشش غیر مشروع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلبہ واقتدار پیغمبر اور صحابہ کرامؓ کی بڑی آرزو اور تمنا رہی ہے۔

واُخریٰ تحبونها نصرٌ من اللّٰهِ و فتحٌ قریبٌ و بشّر المؤمنین ٥	اور ایک چیز دے گا جسے تم عزیز رکھتے ہو مدد اللہ کی اور فتح قریب۔ اور خوشی سنا دو ایمان والوں کو۔
(سورۃ الصف ۱۳)	

نصوص سے اقتدار اور غلبہ کے حصول کے اشارے ملتے ہیں۔ سیرت طیبہ اور تاریخ سے ثابت ہے کہ اس کے لئے مواقع کو استعمال کیا گیا ہے اور اسی لئے علماء اور ائمہ کرام نے اس کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے اور نظام عدل کے قیام اور مظالم کے سدباب کو ضروری قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملت ومدن " دونوں قسم کے مصالح کی تدبیر وانتظام کے لئے ہوئی تھی اور چونکہ امام ان کا نائب اور ان کے امر کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں کام اس کے لئے ضروری ہیں اور نبی کی اطاعت کی طرح اس کی اطاعت بھی واجب ہے۔

(مبحث فی المظالم)

کچھ لوگوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ الفاظ میں حکومت قائم کرنے کا حکم انہیں دکھایا جائے صرف اسی صورت میں وہ اس کے لئے جدوجہد کو صحیح تسلیم کریں گے۔

بتائیں کیسے انہیں خون آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ ولو کیا ہے

جہاد و احتساب:

ایک غلط نظریہ دوسرے غلط نظریہ کو جنم دیتا ہے اور وہ شجر خبیثہ بن کر بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے ایک شخص جب دین و سیاست کی تفریق کا قائل ہوتا ہے تو لازمی طور پر وہ دین کی تنفیذ و اشاعت کے لئے جہاد و احتساب کی ضرورت کا بھی انکار کرنے لگتا ہے۔ احتساب کا اور ضرورت پیش آنے پر اس کے لئے قوت استعمال کرنے کا کوئی خانہ اس کے یہاں نہیں ہوتا ہے۔ وہ نظریہ احتساب کو غیر اسلامی سمجھتا ہے۔ وہ نظریہ احتساب پر تنقید کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے:

"کچھ شاعر اور خطیب قسم کے لوگوں نے مزید آگے بڑھ کر یہ اعلان کر دیا کہ ہم محتسب کائنات ہیں۔ ہمارا منصب ساری کائنات کا احتساب کرنا ہے یہ بات بلاشبہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے کیونکہ محتسب کائنات اگر کوئی منصب ہے تو وہ صرف خالق و مالک کے لئے سزاوار ہے۔ یہ صرف اللہ عزوجل ہے جو اگر چاہے تو کائنات ارض و سما کا احتساب کرے۔ اس کے سوا کسی کے پاس نہ اتنی طاقت ہے اور نہ کسی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔ اس بنا پر اس غیر عقلی اور غیر اسلامی نظریے کے لیے خدا کی کتاب میں دلیل نہیں مل سکتی تھی۔ یہاں رہنماؤں کے شاعرانہ تخیل نے کام کیا چنانچہ ابلیس کی خیالی مجلس شوریٰ منعقد کی گئی اور اس کی فرضی روداد مرتب کر کے ابلیس کی زبان سے اس حقیقت کا اعلان کر دیا گیا کہ

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ حقیقت کا ماخذ خدا اور اس کے رسول کے کلام میں کہیں موجود نہیں۔ اور اگر کسی صاحب کے نزدیک موجود ہو تو وہ مجھے ایسی آیت یا حدیث لکھ کر بھیج دیں جس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ مسلمان محتسب کائنات ہیں۔ مزید

یہ کہ خود اس کو ابلیس کا کلام بھی نہیں کہا جا سکتا۔ فن روایت کے مطابق اس میں یہ نقص ہے کہ ابلیس سے راوی کی ملاقات ثابت نہیں۔ اس بنا پر دینی معاملے میں اس کا حوالہ قطعی غیر معتبر ہے۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود یہ غیر ثابت شدہ کلام ابلیس اتنا پھیلا کہ بڑے بڑے بزرگ اور اکابر اس کو حقیقت واقعہ سمجھ کر دہرانے لگے بلکہ مسلمانوں کے مقام و منصب اور ان کی صحیح حیثیت کو بتانے کے لئے اس کا حوالہ اس طرح دیا جانے لگا کہ جیسے اس کو آخری سند کا درجہ حاصل ہو۔ کیسا عجیب ہوگا امت مسلمہ کا وہ اسلامی منصب جو قرآن و حدیث میں تو نہ بتایا گیا ہو البتہ ابلیس کے مفروضہ کلام سے حیرت انگیز طور پر اسے برآمد کر لیا جائے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان ان ہی غلط رہنمائیوں کے وارث ہیں۔ ان کا ذہن اپنے نام نہاد رہنماؤں کے شاعرانہ اور خطیبانہ اور انشا پردازانہ کلام سے بنا ہے نہ کہ حقیقت میں خدا اور رسول کے سچے کلام سے"

لکھنے والے کی اس تنقید سے جو شخص اسلامی ذخیرہ کتب سے واقف نہ ہو تھوڑی دیر کے لئے ششدر ہو جا سکتا ہے۔ اور توفیق الٰہی دستگیری نہ کرے تو اس پر ایمان بھی لے آسکتا ہے۔ لیکن ایک وسیع المطالعہ شخص کی نظر میں یہ ایک عامیانہ نثر ہے جو لکھنے والے کے فکری انحراف اور اس کے صرف ناقص العلم ہونے کی دلیل ہے۔ مزید یہ کہ اس میں مسخرہ پن بھی موجود ہے۔ اور وہ اس طرح کے شعر کو روایت حدیث کی کسوٹی پر ناپنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور پھر یہ فیصلہ صادر فرما دیا گیا ہے کہ "ابلیس سے راوی کی ملاقات ثابت نہیں ہے"۔ حالانکہ دیکھنا یہ چاہئے تھا کہ اقبال نے بزبان ابلیس اپنی نظم میں جو بات کہی ہے وہ تعلیمات دین کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور اگر وہ تعلیمات دین کے خلاف ہے تو اس کی دلیل بھی پیش کرنی چاہئے تھی۔ اس ناقد کے پاس احتساب کے نظریے کے غلط ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے اس کے باوجود اس نے اپنے رسالہ کے سرورق پر بھی اپنا یہ قول زریں ثبت فرمایا ہے۔

"احتساب غیر کے لئے متحرک ہونا نفس پرستی ہے اور احتساب خویش کے لئے متحرک ہونا دینداری ہے"

نظریہ احتساب ایک اسلامی نظریہ

نظریہ احتساب ائمہ اسلام اور علماء دین کی نظروں میں متفق علیہ نظریہ ہے۔ اگر احتساب کا نظریہ غیر اسلامی نظریہ ہوتا تو بے شمار متقدمین علماء اس دینی نظریہ کو اپنی تصنیفات کا موضوع کیونکر بناتے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ناقد کی نظر متقدمین اور متاخرین کی عربی کتابوں پر نہیں ہے۔ احتساب کے موضوع پر جو مستقل بالذات کتابیں گذشتہ صدیوں میں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ ۔ اس کتاب کے مصنف عبد الرحمان بن نصر الشیرزی ہیں۔ یہ کتاب چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۶ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔

۲۔ معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ ۔ اس کتاب کے مصنف محمد بن محمد القرشی ہیں جو " ابن الاخوۃ " کے نام سے مشہور ہیں ان کا سن وفات ۷۲۹ھ ہے۔ اس کتاب میں ستر ابواب ہیں۔

۳۔ نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ ۔ اس کتاب کے مصنف ابن بسام ہیں یہ کتاب ۱۱۸ ابواب پر مشتمل ہے۔

۴۔ آداب الحسبۃ ۔ اس کتاب کے مصنف محمد بن احمد السقطی المالقی ہیں۔ یہ بارہویں صدی عیسوی کی ابتداء کے علماء میں سے تھے اور اندلس کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں پیرس میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

۵۔ کتاب الحسبۃ ۔ یہ جمال الدین یوسف بن عبد الہادی (متوفی ۹۰۹ھ) کی کتاب ہے۔ یہ کتاب بیروت سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ الحسبۃ فی الاسلام ۔ یہ علامہ ابن تیمیہ کی مشہور کتاب ہے دورِ جدید میں بھی اس موضوع پر کم از کم دو مستقل بالذات کتابیں لکھی گئی ہیں۔

۱۔ الحسبۃ والمحتسب فی الاسلام تالیف دکتور نقولا زیادہ

دورِ جدید میں بھی اس موضوع پر کم از کم دو مستقل بالذات کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ۱۔ الحسبۃ والمحتسب فی الاسلام، تالیف دکتور نقولا زیادہ، ۲۔ الحسبۃ فی الاسلام، تالیف استاذ ابراہیم یسوتی الشہادی ۱۹۹۲۔ نظریہ احتساب کے لئے بہت سے علماء نے اپنی کتابوں میں

ابواب خاص کئے ہیں۔ جن کتابوں میں نظریہ احتساب پر بحث موجود ہے وہ یہ ہیں ۱۔ الاحکام السلطانیہ تالیف الماوردی الشافعی متوفی ۴۵۰، ۲۔ الاحکام السلطانیہ۔ تالیف ابو یعلیٰ الحنبلی متوفی ۴۵۸، ۳۔ احیاء العلوم۔ ج ۲ امام غزالی، ۴۔ مقدمہ ابن خلدون، ۵۔ نہایۃ الادب ج ۶ امام نویری، ۶۔ المدخل تالیف ابن الحاج ۷۔ اغاثۃ الامۃ۔ تالیف مقریزی، ۸۔ صبح الاعشیٰ تالیف قلقشندی

اگر یہ جواب دیا جائے کہ ہم احتساب کے تو قائل ہیں لیکن احتساب کائنات کے قائل نہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ کائنات سے مراد لازماً اجرام سماوی اور مریخ و مشتری نہیں بلکہ "کائن حیّ" عربی زبان میں انسان اور ذی روح مخلوق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور انسان کا احتساب عین اسلامی نظریہ ہے۔ امام ابن تیمیہ نے محتسب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے " واما المحتسب فله الامر بالمعروف والنهى عن المنكر مما ليس من اختصاص الولاة والقضاة واهل الديوان ونحوهم (الحسبة فى الاسلام) یعنی محتسب کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جو والی سلطنت اور قاضی اور ارباب حکومت وغیرہ کے دائرہ اختصاص میں نہیں۔ ابن الاخوہ نے معالم القربہ فی معارفۃ الحسبۃ میں احتساب کے بارے میں لکھا ہے۔

احد اصول الجامعة فى الاسلام والذى اوجبه الله على المسلمين حقا۔	اسلام کے جامع اصولوں میں سے ایک ہے جسے اللہ نے مسلمانوں پر یقینی طور پر فرض کیا ہے۔

قاضی ماوردی نے کار احتساب کو فرض قرار دیا ہے۔ احتساب کو اہل لغت بالقوۃ منع کرنے کے مرادف قرار دیتے ہیں۔ ابن عمید اپنی کتاب " السیاسۃ الشرعیہ" میں احتساب کو واجبات دین میں سے ایک واجب قرار دیتے ہیں

والامر بالمعروف والنهى عن المنكر لا يتم الا بقوة وامارة ومن هنا كانت الامارة او ولاية امر الناس من اعظم واجبات الدين۔	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام طاقت اور حکومت کے بغیر انجام نہیں پاسکتا۔ اسی لئے حکومت اور معاملات مسلمین کی ولایت دین کے اہم واجبات میں سے ہے۔

(ابن عمید، السیاسۃ الشرعیہ، صفحہ ۱۷۳)

ناقد محترم اس موضوع پر اسلام کے ذخیرۂ تصانیف سے واقف نہیں ہیں تو وہ ان آیتوں اور حدیثوں سے ضرور واقف ہوں گے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت اسلامیہ کی ذمہ داری

اور فریضہ منصبی قرار دیا گیا ہے۔ اور وہ عربیت سے اتنے نامانوس نہ ہوں گے کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ لغت کی رو سے امر و نہی کے اندر تحکمانہ شان بھی پائی جاتی ہے۔ اصلاح، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد، قتال، اقامت دین، اقامت حدود شرعیہ و دیگر ہم معنی الفاظ قرآن و سنت اور سیرت کے ذخیرے میں موجود ہیں۔ جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ دین کی حقیقت احتساب کائنات ہے۔

ناقد محترم احتساب خویش کے قائل ہیں۔ اور صرف اسی کو دینداری سمجھتے ہیں۔ اور احتساب غیر کو انھوں نے نفس پرستی قرار دیا ہے۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ احتساب خویش اور احتساب غیر دونوں ہی مشروع ہیں۔ احتساب خویش احتساب کے مرتبوں میں پہلا مرتبہ ہے قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

واما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی	تو جس شخص نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہش سے روکا تو جنت ہی ٹھکانہ ہے۔

(نازعات۔ ۴۱)

ہر انسان کے اندر قوت محتسبہ ودیعت کی گئی ہے۔

فالھمھا فجورھا وتقواھا۔ قد افلح من زکاھا وقد خاب من دسّاھا۔ (والشمس۔ ۱۰)	فسق و فجور اور خیر و تقویٰ کی پہچان اس کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ کامیاب وہ ہے جس نے نفس کو پاک و صاف کیا اور نامراد وہ ہے جس نے اسے بگاڑ دیا۔

خود اقبال کے یہاں صرف احتساب کائنات ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ احتساب ذات، احتساب خویش، اور احتساب نفس کا ذکر بھی موجود ہے۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اس اصلاح اور احتساب خویش کی سنگ بنیاد پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم الشان مستحکم اسلامی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ دنیا میں عدل و قسط کے نظام کے قیام کا انحصار اسی احتساب پر ہے۔ یہ قوت محتسبہ جب اپنا کام کرتی ہے تو اپنی ذات کے باہر بھی کام کرتی ہے اور اہل خانہ اور اہل و عیال کا بھی احتساب کرتی ہے۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ جو شعور اس کے اندر بیدار ہوا ہے اسے وہ اپنے خاندان کے ہر فرد کے اندر جگائے اور دین کی جو فکر احتساب کے اندر ہے وہ دوسروں کے اندر بھی پائی جائے۔

یابنیؑ اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علی ما اصابک ان ذلک من عظم الامور (لقمان)

اے بیٹے نماز کو قائم کر نیکی کا لوگوں کو حکم دے۔ برائی سے روک اور اس فرض احتساب کو ادا کرنے میں جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں ان پر صبر کر یہ بڑے پختہ ارادے اور اعلیٰ درجہ کا کام ہے۔

احتساب منصب خداوندی بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (نحل - ۹۳)

خدا عدل واحسان اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور ہر قسم کی برائیوں اور ہر قسم کے ظلم سے روکتا ہے۔ خدا یہ نصیحت اس لئے کرتا ہے کہ شاید تم لوگ عبرت حاصل کرو۔

جس طرح چاند دنیا کو وہی روشنی دیتا ہے جسے اس نے سورج سے پایا ہے۔ اسی طرح انسان بھی خدائی صفت اختیار کرتا ہے بلکہ خدا کی طرف سے اسے منصب احتساب پر فائز کیا جاتا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آل عمران)

تم دنیا کی بہترین امت ہو جسے انسانیت کی اصلاح کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس دنیا کا نظام خدا کی مرضی کے بجائے ان کی مرضی سے چلا کرے وہ سیاست وحکومت کے میدان سے اہل احتساب کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کا ہاتھ گریبانوں تک نہ پہونچ سکے۔ وہ فرض احتساب ادا کرنے والوں کے قتل سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔

ویقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس

یہ "بدبخت" ان پاک نہاد انسانوں کو قتل کر ڈالتے ہیں جو عدل وصراط مستقیم کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔

احتساب کائنات اس دین کی روح ہے۔ یہی وہ نور ہے جس سے دل اور خاک دان ارضی دونوں منور ہوتے ہیں۔ یہ روح فرد کے اندر بھی پائی جاتی ہے اور جماعتوں کے اندر بھی حقیقت ایک ہے اس کے احوال ومدارج بے شمار ہیں۔ یہ روح جب بڑھتی اور پھیلتی ہے تو ایک عادلانہ نظام اور اسلامی خلافت کے اندر نمایاں ہوتی ہے۔

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔

وہ خدا کے مومن بندے اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز قائم کریں گے اور زکات دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اور انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے

یہی روح احتساب ایک ذمہ دار اور فرض شناس گروہ انسانی کے کردار میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ آناء اللیل وھم یسجدون، یؤمنون باللہ والیوم الاٰخر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات اولئک من الصالحین۔ (آل عمران ۱۱۴)

وہ حق پرست جماعت جس کے افراد کا حال یہ ہے کہ راتوں کو اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے سر اس کے آگے جھکے رہتے ہیں اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں کے لئے سرگرم رہتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا شمار صالحین میں ہے۔

احتساب غلط روی سے باز رکھنے اور روکنے کا نام ہے۔ جہاد و قتال بھی اس کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ جب دنیا باطل کو اختیار کرتی ہے اور حق کی آواز پر کان نہیں دھرتی۔ تو احتساب کے لئے قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھنے کا حکم بھی دیا جاتا ہے۔

یاایہاالنبی جاھد الکفار والمنٰفقین · اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو

دنیا کی قوموں سے احتساب اس وقت تک جاری رہے گا جب تک دنیا میں قومیں فساد پھیلاتی رہیں گی اور کمزوروں پر ظلم کرتی رہیں گی۔ ظالم سے جنگ فی سبیل اللہ جنگ ہے اور یہ خدا کی خوشنودی کے لئے کی جاتی ہے۔

قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ · ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

اور

حتی تضع الحرب اوزارھا · یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے

اپنی مدافعت کے لئے اٹھنا بھی احتساب ہی ایک شکل ہے۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا (الحج ۔ ۳۹)

جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انھیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے۔

صرف اپنی مدافعت کے لئے نہیں بلکہ دوسرے مظلوموں کی حمایت اور نصرت کے لئے کھڑا ہونا بھی احتساب ہی کی ایک شکل ہے جس کا حکم قرآن میں موجود ہے۔

ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا

تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس شہر سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جفاکار ہیں۔ اور ہمارے

واجعل لنا من لدنك ولیا۔ واجعل لنا من لدنك نصیرا۔ | لے اپنی طرف سے محافظ اور مددگار مقرر فرما۔

قوموں میں ایسے گروہ کا پایا جانا ضروری ہے جو احتساب کا فرض انجام دے ورنہ ظلم و زیادتی اور بے انصافی کی کثرت عذاب الٰہی کے بھڑکنے کا سبب بن سکتی ہے۔

فلولا کان من القرون من قبلکم اولو بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض الا قلیلا ممن انجینا منھم۔ واتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیہ وکانوا مجرمین۔ وما کان ربك لیھلك القری بظلم واھلھا مصلحون۔ (ہود - ۱۱۷)

پس کیوں نہ تم سے پہلے قوموں میں ایسے نیکوکار لوگ اٹھے جو انھیں زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔ ایسے لوگ بہت تھوڑے تھے جنھیں ہم نے ان میں سے بچالیا۔ ورنہ سارے ظالم لوگ ان لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان ان کو عطا کئے گئے تھے اور وہ بڑے خطاکار تھے اور میرا رب ظالم نہیں کہ شہر کو تباہ کرے حالانکہ اس کے باشندے اصلاح کا کام انجام دے رہے ہوں۔

اگر کوئی گروہ احتساب کے لئے کھڑا نہ ہو اور معصیت خداوندی سے منع کرنے کی خواص کو بھی توفیق نہ ملے تو خدا کا عذاب عام و خاص سب کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ۔ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذلك عذب الخاصۃ والعامۃ۔ (مسند احمد)

اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کی باعث اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک کہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے دیکھیں اور انھیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کے اندر پہلا نقص جو پیدا ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ان کے اندر روح احتساب ختم ہو گئی تھی اور ان کے اندر ایک قسم کی مصنوعی رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ برائیوں کے ساتھ Adjustment کا عجیب مزاج بن جاتا ہے۔ تو پہلے مرحلے میں انسان برائی کو برداشت کرتا ہے اور دوسرے مرحلے میں خود اس برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ ابتدا میں ان کے اندر روح احتساب زندہ تھی لیکن آہستہ آہستہ ختم ہو گئی روایت میں موجود ہے کہ

کان الرجل یلقی الرجل فیقول یا ھذا | پہلے ایک شخص جب دوسرے سے ملتا تو کہتا تھا کہ اللہ سے

اتق اللہ - ودع ما تصنع فانہ لا یحل لك — خوف کھاؤ - اب یہ کام چھوڑ دو یہ جائز نہیں ہے - لیکن
ثم یلقاہ من الغد فلا یمنعہ ذلك ان یکون — دوسرے دن اس سے ملتا تو حرام اور گناہ اسے ہم نوالہ
أکیلہ وشریبہ وقعیدہ - — ہم پیالہ اور ہم نشیں بننے سے باز نہ رکھتا -

اس مصاحبت اور دوستی کے نتیجے میں ان پر ایک دوسرے کی برائی کا اثر پڑگیا "ضرب اللہ قلوب بعضهم ببعض"، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے اور جوش وجذبے کے ساتھ ارشاد فرمایا -

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف — خدا کی قسم تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو بدکار کا ہاتھ
ولتنهون عن المنکر ولتأخذن علی ید المسیٔ — پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے
ولاتطرنہ علی الحق اطراء اولیضربن اللہ — دلوں کو بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا - یا تم پھر بھی
قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم — اسی طرح کی لعنت کرے گا جس طرح ان پر لعنت کی تھی -
کما لعنهم -

قرآن میں بنی اسرائیل کا احتساب سے جی چرانے اور بزدلی دکھانے کا عبرتناک انجام بھی دکھلایا گیا ہے - بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا -

یاموسی ان فیها قوما جبارین وانا — اے موسیٰ! وہاں ایک جابر قوم رہتی ہے، جب تک وہ
لن ندخلها حتی یخرجوا منها فان یخرجوا — نکل نہ جائے ہم داخل نہیں ہو سکتے اور جب وہ نکل جائیں گے
منها فانا داخلون (مائدہ - ۲۲) — تو ہم ضرور داخل ہوں گے -

اس بزدلی اور پست ہمتی کی بدولت قدرت الٰہی نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ وہ چالیس برس تک دربدر کی خاک چھانتے پھریں -

قال فانها محرمة علیهم اربعین سنة — چالیس سال تک اب وہ حرام ہے ان کے لئے ان کے لئے اور وہ
یتیهون فی الارض (المائدہ - ۲۰۶) — زمین میں بھٹکتے رہیں گے -

قرآن میں بنی اسرائیل کے مبتلائے لعنت ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے

کانوا لا یتناهون عن منکر فعلوہ — وہ ایک دوسرے کو ان بری باتوں سے نہ روکتے تھے جو وہ کیا کرتے تھے -

ایک آیت میں جہاد واحتساب کے لئے اٹھنے کو اصل کامیابی قرار دیا گیا ہے - اور یہ بتایا گیا ہے

کہ اس کا درجہ عام نیکی اور معروف کے کاموں کے مقابلے میں اعلیٰ وارفع ہے۔ دین کی سربلندی کے لئے جہاد حجاج کی خدمت اور مسجد حرام کی آبادکاری سے بڑھ کر ہے۔

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام	کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے
کمن اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وجاھدوا	کے کام کو اس شخص کے برابر سمجھ لیا ہے جو اللہ اور آخرت
فی سبیل اللہ لایستوون عند اللہ واللہ	کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ اللہ
لا یھدی القوم الظلمین۔ الذین اٰمنوا و	کے نزدیک دونوں کا مرتبہ برابر ہے۔ اور اللہ ظالموں کو
ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم	ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے۔ ہجرت کی اور
وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ اولئک	اللہ کی راہ میں اپنے جان ومال سے جہاد کیا۔ اللہ کے
ھم الفائزون (التوبہ ۲۰)	نزدیک وہی بڑے مرتبے کے لوگ ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

حدیث میں حد شرعی کے قیام کو چالیس دن کی بارش سے زیادہ نفع بخش اور برکت انگیز بتایا گیا ہے۔

اقامۃ حد من حدود اللہ خیر من مطر	اللہ کے حدود میں کسی حد کا قائم کرنا۔ اللہ کی سلطنت میں
اربعین لیلۃ فی بلاد اللہ عزوجل	چالیس دن کی بارش سے زیادہ بہتر ہے۔

یہ معلوم ہے کہ بارش سے فصل تیار ہوتی ہے اور رزق میں اس سے برکت ہوتی ہے۔ مگر اقامتِ حدود سے جو برکت ہوتی ہے وہ بارش کی برکت سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ اقامت حدود سے فتنہ وفساد اور معصیت وگناہ کی جڑ کٹتی ہے اور ملک میں امن وامان اور عافیت وسکون کا دور دورہ ہوتا ہے۔

احتساب کے مفہوم میں اصلاح اور بقدر ضرورت طاقت کا استعمال بھی داخل ہے جن علماء نے "حسبہ" یعنی احتساب کو اپنی تالیف کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے احتساب کی یہی تعریف کی ہے قصاص بھی احتساب ہی کی ایک شکل ہے۔ یعنی احتساب کے لئے ضرورت پیش آنے پر انسانی خون کو ارزاں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اسے تمدنی زندگی کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے، قرآن میں ہے۔

ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب	اے عقلمندو! قصاص میں تمھارے لئے زندگی ہے۔

ظالم کو ظلم سے روکنا اور اس کا ہاتھ پکڑ لینا بھی احتساب کی ایک شکل ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔

انصر اخاك ظالماً او مظلوماً — اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم

یہ دورِ جاہلیت کا ایک رائج محاورہ بھی تھا۔ لیکن اسلام نے صحابہ کرام کے ذہن و فکر کو اتنا بدل دیا تھا کہ انھیں حیرت ہوگی اور وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ مظلوم کی مدد تو ٹھیک ہے لیکن ظالم کی مدد کیسے اور کیوں کر۔ آپ نے فرمایا۔

تاخذ فوق یدیہ — تم اس کا ہاتھ پکڑ لو اور ظلم سے اسے روکو

مومن کے لئے احتساب اس کے ایمان کی دلیل ہے۔ حدیث میں ہے۔

من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ و ذالك اضعف الایمان (مسلم)

تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اسے اپنے ہاتھ سے (طاقت سے) بدل دے اور جو یہ نہ کر سکے وہ زبان سے بدلنے کی کوشش کرے۔ اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ دل سے برا سمجھے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

یہاں "ید" کا لفظ مجازاً قوت کے لئے استعمال ہوا ہے بذریعہ قوت روک دینا استطاعت اور ضرورت پر موقوف ہے۔

عقلی دلیل

ایک ایسے دین میں جو دنیا و آخرت کی برکتوں کا ضامن ہو صرف احتساب خویش کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ احتساب غیر اور احتساب کائنات بھی اس کے احکام کا ایک حصہ ہوگا جس طرح انسان کا اپنا نفس سرکش باغی اور معصیت کا دلدادہ ہو سکتا ہے اس طرح دنیا کی قومیں بھی سرکش اور باغی ہو سکتی ہیں اور دنیا کو ظلم و فساد سے بھر سکتی ہیں۔ جس طرح ایک فرد سے ظلم کا صدور ممکن ہے۔ اس طرح قوموں اور حکومتوں سے بھی ظلم کا صدور ممکن ہے۔ جب بھی کسی گروہ یا جماعت کی طرف سے ایسا رویہ سامنے آئے گا جس کی وجہ سے معاشرے میں عام بگاڑ پھیل جائے محاسن کے بجائے رذائل نیکی کے بجائے معصیت انصاف کے بجائے ظلم عام ہونے لگے تو اسلام کی روح احتساب لازماً حرکت میں آئے گی۔ احتساب تمدن و تہذیب کا تقاضا بھی ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے اور متمدن زندگی میں صرف شیریں سخنی کام نہیں آتی بلکہ ظلم و فساد کی بیخ کنی بھی ضروری ہوتی ہے۔ جہاں وعظ و تلقین سے کام نہیں چلتا وہاں طاقت کا استعمال

ضروری ہوتا ہے۔ اور عقوبت و سرزنش کی نوبت آتی ہے۔ انسان کے جسم کے کسی عضو میں اگر زہریلا مادہ بھر گیا ہو جس سے انسان ہی کی ہلاکت کا اندیشہ درپیش ہو تو عقل و مصلحت کا تقاضہ بھی ہے کہ اس عضوِ فاسد کو کاٹ کر پھینک دیا جائے تاکہ جسم کی صحت برقرار رہے۔ اگر صرف تذکیر و نصیحت سے کام چل سکتا تو دنیا میں قوانین کا وجود نہ ہوتا۔ اور نہ کہیں تعزیرات نافذ ہوتے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے بھی کبھی کبھی سختی اور احتساب کا متقاضی ہے۔ صرف وعظ کہہ کر اسے سیدھے راستے پر نہیں چلایا جا سکتا۔ یہ روح احتساب قرون اولیٰ میں کارفرما تھی اور یہی وہ حقیقت تھی جس کی تلقین حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد مسلمانوں کو کی تھی۔

فاذا رأیتمونی قد استقمت فاتبعونی — اگر تم مجھے سیدھے راستے پر چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو اور اگر

وان زغت فقوّمونی — دیکھو کہ ٹیڑھا ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔

نظام اسلامی کیا ہے اور اسلام کا دائرۂ عمل کتنا وسیع ہے۔ قوت اور اقتدار اور جہاد اور احتساب کی ضرورت اور اہمیت پر کیوں زور دیا گیا ہے مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر ماجدی میں آیت "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر" کی تفسیر میں ان الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

"آیت کے اس جز میں امت اسلامی کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی زندگی کے کامل اور مکمل ہونے کا پورا قوام آ گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو تم اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرو، تم توحید کے امانتدار ہو، زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ ہو، بہ طور اس کی پولیس کے ہو الہٰی قانون کے نفاذ و تحفظ کے لئے۔ دنیا کے نظام عدل کو برقرار رکھنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تمہاری زندگی کا مشن ہی یہی ہے کہ حکومت الٰہیہ کو چلاؤ، نظام حق کے ایک ایک کل پرزہ کو درست رکھو اور نظام باطل کا زور چلنے ہی نہ دو۔ ظلم ہوتا اگر اس ذمہ دار فعال (ایگزیکٹو) جماعت کو جدال و قتال کی آزادی نہ ملتی۔ بلا اجازت جہاد، بلا اجازت اجراء حدود و تعزیرات اس قوم پر ذمہ داریاں ڈال دیتے کے معنی یہ ہوئے کہ ہاتھ پیر باندھ کر حکم دریا میں تیرنے کا دیا جا رہا ہے۔

کیا تماشہ ہے اگر انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دیں تو ملک کیلئے محسن، ہندوؤں میں اگر بچپن کی شادیوں کو روک دیں تو ان کا شکر واجب، لیکن جب اللہ کے سپاہی اور مالک الملک کے پیارے اگر یہ حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانون الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امن عالم کو غارت کر کے رکھ دینے والوں کی دارو گیر کریں تو یہ روشن خیالی، کی جبین تحمل پر شکن آجائے اور تہذیب کے پروپیگنڈسٹ اسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگیں، منکر کے تحت آج کے شراب خانے اور تھیٹر، سینما اور کنسرٹ ہال، ناچ گھر اور میوزک کالج، اسکول آف آرٹس اور تصویر خانے سب آجاتے ہیں۔ آیت سے ظاہر ہے کہ اس امت کی خیریت وافضلیت اس وقت تک ہے جب تک وہ ان صفات کی حامل ہے یعنی ایمان باللہ میں مضبوط ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایجابی اور سلبی دونوں قسم کی اخلاقی خوبیوں پر قائم ہو"

(تفسیر ماجدی آل عمران حاشیہ ۲۲۷)

خلافت کا تصور

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تخلیق آدم کا قصہ سناتے ہوئے فرمایا۔

واذ قلنا للملئکۃ انی جاعل فی الأرض خلیفۃ۔ (البقرہ ۱۳)	اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الأرض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوٰی فیضلک عن سبیل اللہ ط ان الذین	اے داؤد ہم نے بنایا تجھ کو نائب ملک میں تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے اور نہ چل جی کی خواہش پر کہ وہ بہکا دیگا

یضلون عن سبیل اللہ لھم عذابٌ
شدید بما نسوا یوم الحساب۔
(سورہ ص ۲۶)

تم کو اللہ کے راستے سے۔ جو لوگ اللہ
کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں ان کیلئے
سخت عذاب ہے اسلئے کہ انہوں نے
بھلا دیا حساب کا دن۔

قرآن مجید میں خلیفہ کا لفظ مع مشتقات متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کا مفہوم کیا ہے اور حضرت آدمؑ کس کے خلیفہ تھے۔ عربی زبان وبیان اور ادب کے ماہرین کے نزدیک خلیفہ سے مراد اسلامی قانون کے مطابق زمین پر حکومت کرنے والا اور قوانین تشریعیہ کو نافذ کرنے والا اور اللہ کے دین کی حفاظت کرنے والا ہے۔ جاحظ (کتاب الحیوان ۱/۱۴۲) ثعالبی (فقہ اللغہ ص ۳۶۲) اور امام راغب اصفہانی (مفردات القرآن ص۱۵۶) نے لفظ خلیفہ کی یہی تشریح کی ہے۔ طبری کی رائے بھی یہی ہے۔ امام راغب اصفہانی کی تشریح میں یہ بھی مذکور ہے کہ خلافت مستخلف کو عزت بخشنے کے لئے دی جاتی ہے۔ اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ خلیفۂ راشد حضرت علیؓ نے (العقد الفرید لابن عبد ربہ ۲/۲۱۱ اور نہج البلاغہ ص ۴۹۷) علماء حق اور داعیانِ دین متین کے لئے خلفاء اللہ فی الارض کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جو حضرات انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کی نفی کرتے ہیں ان کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جسے فی الواقع دلیل کہا جا سکے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں انسان کو اللہ کا نائب اور خلیفہ لکھا ہے (نائبہ وخلیفتہ) ازالۃ الخفاء میں حضرت داؤدؑ کیلئے خلیفۃ اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ انی جاعل فی الأرض خلیفۃ کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی خلافت ہے۔

"جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشیں ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشیں ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی۔"

(سیرۃ النبی جلد ہفتم)

علوم قرآنی کے قدیم ماہرین میں امام راغب اصفہانی اور طبری کی یہی رائیں ہیں۔ اردو مترجمین اور مفسرین قرآن میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور مولانا مودودی کا یہی خیال ہے خلیفہ وہ ہے جو علم و عقل و فراست سے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنے والا ہے اور ان قوتوں کو احکام الہٰی کے اجراء کے لئے استعمال کرنے والا ہے۔ خلیفہ اول حضرت آدمؑ تھے اور ان کی تبعیت میں ہر ابن آدم بالقوہ خلیفہ ہے۔ حکم الہٰی کو نافذ کرنے والا بالفعل خلیفہ ہے۔ کفر اور بغاوت سے خلیفہ، غیر خلیفہ بن جاتا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من امر بالمعروف ونهى عن المنكر فهو خليفة الله في ارضه وخليفة رسوله وخليفة كتابه۔	جس شخص نے معروف کا حکم دیا اور منکر سے روکا وہ خدا کی زمین پر خدا کا خلیفہ ہے اور خدا کے رسول کا خلیفہ ہے اور خدا کی کتاب کا خلیفہ ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۴ ص ۴۷)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ انسان کی خلافت اور فرشتوں پر اس کی فضیلت اس کے علم کی وجہ سے ہے "علم آدم الاسماء"، علم اللہ کی صفت ہے اور عبادت اس کے بندوں کی صفت ہے اس لئے علم کا مقام عبادت سے بلند ہے۔

یہ درست ہے کہ قرآن میں کہیں خلیفۃ اللہ کا لفظ صراحت کے ساتھ نہیں ہے لیکن اسلامی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں خلافت الٰہیہ کا تصور نہ پایا جاتا ہو۔ خلیفۃ اللہ کا صرف مفہوم نہیں بلکہ یہ لفظ بھی حدیث اور آثار صحابہؓ اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی زبان پر رہا ہے مسند احمد (۴۰۳/۵) ابو داؤد (۴۲۴۴) اور مستدرک حاکم (۴۲۳/۴) ابن ماجہ (۴۰۸۴) اور بیہقی کی دلائل النبوۃ (۵۱۵/۶) میں خلیفۃ اللہ کے الفاظ صراحت کے ساتھ مذکور ہیں۔ ایک جگہ ہے۔

فان رأیت یومئذ خلیفة اللہ فی الأرض فالزمہ۔ — یعنی اس وقت اگر تم خلیفۃ اللہ فی الارض کو پاؤ تو اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کرو۔

دوسری جگہ مہدی کے لئے فانہ خلیفۃ اللہ مہدی کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ مزنی جو امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں اپنے شعر میں حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۃ اللہ قرار دیتے ہیں۔

فإن أبا بکر خلیفة ربہ — وکان ابوحفص علی الخیر یحرص

(مناقب امام شافعی للبیہقی ص ۱/۴۴۰)

یعنی بے شک ابوبکرؓ اپنے رب کے خلیفہ ہیں اور ابوحفص عمر خیر و نیک کاموں کے حریص اور اس پر آمادہ کرنے والے ہیں۔

احادیث آثار صحابہ اور اس شعر کو سامنے رکھ کر حضرت ابوبکرؓ کے اس قول کی تشریح آسان ہو جاتی ہے کہ جب ایک شخص نے انہیں خلیفۃ اللہ کہہ کر مخاطب کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

أنا خلیفة محمد صلی اللہ علیہ وسلم وأنا راض بذلک۔ (مسند احمد ۱/۱۰) — میں حضرت محمدؐ کا خلیفہ ہوں اور میں اس پر راضی بھی ہوں۔

مسند احمد میں وہ روایت بھی موجود ہے جس میں صراحت کے ساتھ لفظ خلیفۃ اللہ آیا ہے اور پھر اسی مسند احمد میں حضرت ابوبکرؓ کی مذکورہ بالا روایت آتی ہے۔ تطبیق کی شکل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک خلافت الٰہیہ کا تصور غلط نہیں تھا لیکن اس تصور کی جلالت شان کی وجہ سے انہوں نے اس کی تردید تو نہیں کی البتہ از راہ حیاء و تواضع یہ کہا کہ میں حضورؐ کا خلیفہ ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء میں یہی بات لکھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ لقب اپنے لئے پسند نہیں فرمایا تھا۔ خود شاہ صاحبؒ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے خلیفۃ اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافت الٰہیہ کا تصور غلط نہیں ہے۔ اگر سرے سے یہ تصور ہی غلط ہوتا تو حدیث میں لفظ خلیفۃ اللہ کیوں پایا جاتا۔ مناقب امام شافعیؒ میں حضرت ابوبکرؓ کے لئے شعر میں خلیفۃ ربہ کا لفظ موجود ہے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ایک بار حضرت ابوبکرؓ نے اپنے لئے خلیفۃ الرسول کا لقب

بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ بھی ازراہ تواضع و انکسار ہی تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا تو آپ نے فرمایا۔

لا، قال فما انت قال أنا الخالفة بعده۔ — نہیں میں خلیفۂ رسول نہیں ہوں اس نے پوچھا پھر آپ کیا ہیں تو انہوں نے کہا کہ میں رسول کے بعد آنے والا ہوں۔

(لسان العرب مادہ خلف)

مسند احمد (۳/۴۴/۴) اور جامع ترمذی (۲۲۲۴) میں سلطان اللہ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے مراد بھی خلیفۃ اللہ ہے۔

لفظ خلیفۃ اللہ کی عظمت و جلالت کی وجہ سے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح ایک ملاقاتی کو یہ کہا تھا کہ بہتر ہے کہ تم مجھے امیر المومنین سے خطاب کرو لیکن ایک قصیدہ میں ان کے لئے خلیفۃ اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(ابن جوزی سیرۃ عمر بن عبد العزیز)

عہد اسلامی اور عہد عباسی کے شعراء اپنے قصائد میں کہیں خلیفۃ اللہ اور کہیں خلیفۃ الرحمٰن کا لفظ استعمال کرتے رہے ہیں۔ جمہرۃ اشعار العرب اور الاغانی اور دیگر دواوین میں یہ اشعار موجود ہیں مثال کے طور پر اموی دور کے ایک شاعر نے خلیفہ عبد الملک ابن مروان کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا۔

أخليفة الرحمٰن انا معشر — حنفاء نسجد بكرة واصيلا

(جمہرۃ اشعار العرب ۹۳۸/۲)

اگر روح اسلام کو سمجھے بغیر متعارض روایات کو ہی سامنے رکھنے کی کوشش ہوگی تو بسا اوقات خام ذہن کے انسانوں میں یہ کنفیوزن پیدا ہوگا کہ خلافت اللہ کی ہے یا رسول کی یا مسلمانوں کی۔ یہ درست ہے کہ سلف میں بعض علماء نے کسی کو خلیفۃ اللہ کہنے سے منع بھی کیا ہے۔ ان علماء میں علامہ ابن تیمیہؒ کا نام نمایاں ہے لیکن ان حضرات کی ممانعت بھی یا تو اس لفظ کی جلالت شان کی وجہ سے ہے یا اس وجہ سے ہے کہ بعض جاہل لوگ اللہ کی ذات کو غائب

سمجھ کر انسان کو اس کا قائم مقام نہ سمجھ لیں اور اس سے کہیں مشرکانہ تصور نہ پیدا ہو جائے۔ امام ابن تیمیہؒ اس بارے میں بے حد حساس ہیں اور بعض اوقات جوش تردید میں ان سے غلو بھی ہو جاتا ہے۔

بعض تفسیری اختلافات اور علماء کے مختلف اقوال کو سامنے رکھ کر مخمصے میں گرفتار ہونے کے بجائے تصور خلافت کو سمجھنے کے لئے چند اصولی باتوں کو ذہن نشیں کر لینا مناسب ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے، حکمراں ہے ایک وہی باقی بتان آذری۔ دوسری بات یہ کہ خدا کا تکوینی حکم جس طرح پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اسی طرح لامحالہ اس کا تشریعی حکم زمین پر نافذ ہونا چاہئے۔ تیسری بات یہ کہ اس تشریعی حکم کو نافذ کرنے والی ذات ابن آدم کی ہوگی اور اسی مفہوم میں اللہ نے حضرت آدمؑ کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ خلیفہ گویا اللہ کی طرف سے زمین پر مقرر کردہ حکمراں ہے اور خلافت حقوق اللہ کی نگہداشت اور زمین پر اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کا نام ہے کیونکہ جس نے پیدا کیا صرف اسی کو حق ہے کہ حکم دے اور حکومت کرے۔ بائبل کے الفاظ میں "تیرا حکم اور تیری مرضی جیسے آسمانوں پر نافذ ہے زمین پر بھی نافذ ہو"۔

ابلیس نے تخلیق آدم کے وقت خدا کو جو چیلنج دیا تھا وہ یہ تھا کہ میں تیرے بندوں کو تیری عبادت سے روکوں گا اور انسانوں کو ہر طرح سے گمراہ کروں گا۔ ابلیس جب اس میں کامیاب نہیں ہو پاتا ہے کہ ذاتی زندگی میں عبادت سے روکے تو وہ اجتماعی نظام میں خدا کے سوا دوسروں کی حاکمیت کا تصور پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ مسلمانوں کی مکمل اکثریت کی آبادی میں بھی یہ سوچ پیدا کر دیتا ہے کہ بس ذاتی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کافی ہے رہا اجتماعی اقتصادی اور سیاسی نظام تو یہ خالص دنیاوی معاملہ ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں اور یہ قانونِ الٰہی سے آزاد ہے اور اس بارے میں دنیا کے دوسرے دساتیر وقوانین کی پیروی میں حرج نہیں۔

کچھ اہل قلم ذہنوں میں یہ الجھن پیدا کرتے ہیں کہ خلافت کا معاملہ صرف استنباطی ہے اور یہ

واضح نہیں کہ خلیفہ سے مراد خلیفۃ اللہ ہے یا خلیفۃ الرسول یا خلیفۃ المسلمین اس لئے آیت خلافت سے حکومت واقتدار کی اہمیت پر استدلال درست نہیں لیکن حکومت واقتدار کی دینی اہمیت صرف لفظ خلیفہ سے نہیں بلکہ دوسری دلیلوں سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خلافت کی یہ تینوں نسبتیں اپنی جگہ پر درست ہیں اور ان کے درمیان تعارض نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن میں دین کی نسبت بھی الگ الگ اضافت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ایک جگہ آیا ہے "یدخلون فی دین اللہ أفواجًا"، یہاں دین کی نسبت اللہ کی طرف ہے۔ دوسری جگہ "لکم دینکم ولی دین"، یہاں دین کی نسبت انسانوں کی طرف ہے پھر جمعہ کے خطبہ میں خطیب یہ دعا کرتا ہے کہ "اللھم انصر من نصر دین محمد"، یہاں دین کی نسبت رسول کی طرف ہے۔ ان مختلف اضافتوں سے دین کے مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے اسی طرح سے انسان اللہ کا خلیفہ بھی ہے اور خلفاء راشدین خلیفۃ الرسول تھے اور ان کی خلافت، خلافت علی منہاج النبوۃ تھی اور مسلمانوں کا دینی حکمراں خلیفۃ المسلمین ہے۔

اسلامی خلافت کا تسلسل:

تنفیذ شریعت اور خلافت الہیہ کا یہ تصور ہے جس کی رو سے دنیا میں مسلمانوں کی آبادیوں میں دینی امارت اور حکومت بھی لازم قرار پاتی ہے اس کے لئے علماء نے امامت کبریٰ کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو اس طرح منتشر چھوڑنا کہ ان کا کوئی دینی امیر نہ ہو جو ان کے حالات کی اسلامی قوانین کے مطابق تدبیر و تنظیم کرے جائز نہیں۔ اگر دنیا کے کسی ملک میں مسلمان صرف فرائض نہیں بلکہ نوافل کا اہتمام کرنے والے کیوں نہ بن جائیں لیکن ان کی دینی حکومت نہ ہو اور وہ اسلامی نظام نہ قائم کریں تو ان کا اسلام غیر معتبر ٹھہرے گا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے کہ امارت وخلافت اس درجہ اہم چیز ہے کہ آپ کے جاں نثار صحابہؓ نے آپ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے مسئلے کو جسم اطہر کی تدفین پر مقدم رکھا۔ اسلام کی تاریخ میں خلیفہ عباسی معتصم باللہ کی شہادت (۶۵۶ھ) تک انقطاع خلافت کا کوئی وقفہ نہیں پایا گیا۔

معتصم باللہ کی شہادت کے ساڑھے تین سال کے بعد مصر کے سلطان الملک الظاہر بیبرس نے ۶۵۹ھ میں عباسی خاندان کے ایک فرد مستنصر باللہ کو خلیفہ بنایا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ ۹۹۳ ہجری (۱۵۱۷ عیسوی) سلطان سلیم ثانی نے مصر و شام، عراق اور مشرق وسطیٰ کو عثمانی سلطنت کی تولیت میں دے دیا اور اس وقت کے برائے نام خلیفہ متوکل سے خلافت کا پروانہ حاصل کر لیا اور مرکز خلافت کو مصر سے قسطنطنیہ کو منتقل کر لیا۔ پھر تاریخ میں دنیا کے مسلمان نظام اجتماعی کی برکت اور خلیفہ کے سایۂ ہمایونی سے ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد اس وقت محروم ہوئے جب ترک ناداں نے قبائے خلافت چاک کر دی۔ عالم اسلام نے اس پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ بنائے خلافت کے پھر سے استوار ہونے کے بظاہر نہ امکانات ہیں نہ عالم اسلام میں اس کی سنجیدہ کوشش ؎

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں وہ ہری رہی

اسلامی تاریخ میں خلیفہ معتصم باللہ کی شہادت کے بعد جب صرف ساڑھے تین سال کا وقفہ تھا جو بغیر خلافت کے تھا تو مسلمان بے چین تھے کیونکہ دین کا ایک اہم رکن مفقود ہو گیا تھا مشہور مورخ ابن کثیر اس وقفے کے دوران جب نئے سال کا ذکر کرتا ہے تو اس کے قلم سے یہ غم انگیز جملہ نکلتا ہے۔

"سن ہجری شروع ہوتا ہے اور صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی خلیفہ نہیں"

خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد رفتہ رفتہ پورے عالم اسلام میں خلافت کی دینی و شرعی ضروریات کے بارے میں تدریجی بے حسی بڑھتی جا رہی ہے اور اب ایسے علماء خال خال ملیں گے جن کے لیے یہ غم دل کا داغ اور سینے کا چراغ بن چکا ہو۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے خلافت کی ضرورت اور اہمیت پر بہت کچھ لکھا ہے اور وہ اس کے نقیب اور داعی ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس طویل عرصہ پر جو بغیر کسی خلافت کے گذرا ہے تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"مسلمان مؤرخین اگر یہ دیکھتے مسلمان اب تک بلا خلیفہ کے ہیں اور وہ اس زمانے میں ہوتے اور اس طویل مدت کو دیکھتے جو بغیر خلافت و امارت ہی کے نہیں بلکہ بغیر کسی احساس و شعور اور فکر کے گذر رہی ہے تو ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتے"

(ارکان اربعہ)

مولانا نے اپنی کتاب ارکان اربعہ میں جو خلافت و امارت کے موضوع پر نہیں بلکہ نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج کی حکمت اور آداب کے موضوع پر ہے۔ زکوٰۃ کے اجتماعی نظام پر بحث کرتے ہوئے حاشیے میں لکھتے ہیں۔

"مسلمان خلافت اور امارت کا نظام قائم کرنے کے شرعی طور پر مکلف ہیں۔ اور اس میں کوتاہی اور سہل انگاری ان کو گناہگار بنا سکتی ہے"

دور قدیم میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کے نظام امارت و خلافت اور حکومت و اقتدار کا قائل نہ ہو اور اسے شرعی طور پر ضروری نہ سمجھتا ہو۔ یہ صرف جدید دور کی خصوصیت ہے کہ مسلمانوں میں بدقسمتی سے ایسے اہل قلم پیدا ہوئے اور اب تک موجود ہیں جو حکومت الہیہ کی شرعی و دینی ضرورت کا انکار کرتے ہیں۔

گذشتہ مباحث کا خلاصہ :

سارے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علمائے اسلام کی تشریح کے مطابق انسان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ ہے کیونکہ انسان کے خمیر میں علم ذہانت، جستجو اور اکتشاف، احکام الٰہی کی بجا آوری اور عبادت کا جو ملکہ ودیعت کیا گیا ہے اس کے اعتبار سے وہی اس منصب بالا کا مستحق ہے۔ انسان کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ہم نے انسان کو بہتر ساخت کا پیدا کیا۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ اللہ تعالیٰ نے تمہاری صورتیں بنائیں اور اچھی صورتیں بنائیں۔

پھر انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے اور اس کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ فرمایا گیا ہے۔

وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا

ہم نے بنی آدم کو فضیلت دی اور انکو خشکی اور دریا میں ہم نے اٹھایا اور انکو بہترین چیزوں کا رزق عطا کیا اور انکو بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

فرشتوں سے جو مقربانِ بارگاہ الٰہی ہیں اور جو کارخانہ قدرت کے کارندے ہیں حضرت آدم کو سجدہ کرایا گیا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ۔

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو آدم کو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے لیکن اس اعتبار سے کہ قرآن اور تعلیمات پیغمبر کے امین اور اس کو نافذ کرنے کی استعداد رکھنے والے اہل ایمان ہیں وہی خلافت ارضی اور حکومت اور تمکین فی الارض کے حقدار ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ خلافت کی صلاحیت رکھنے والے اہل ایمان کے منظر سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے یا اور دوسرے تکوینی مصالح کے تحت اللہ تعالیٰ دوسروں کو بھی زمینی اقتدار اور حکومت عطا کرتا ہے۔

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ۔

زمین اللہ ہی کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بناتا ہے۔

لیکن حکومت اور زمین کی خلافت کے حقدار اہل ایمان ہی ہیں اگر ان کے اندر اوصاف پائے جائیں۔

ان الارض یرثها عبادی الصالحون۔

زمین کی خلافت کے وارث صرف میرے نیک بندے ہیں۔

اور اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے صاحب ایمان نیک بندوں کو نیابت و خلافت کے

فرائض سپرد کرے گا۔

وعد الله الذین اٰمنوا منکم	اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اہل ایمان اور
وعملوا الصالحات لیستخلفنهم	صالح لوگوں سے اس کا وعدہ کیا ہے کہ وہ انکو
فی الارض کما استخلف الذین	زمین میں حاکم بنائے گا جس طرح کہ تم
من قبلکم۔	سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے جادہ مستقیم پر چلنے والے انسانوں کے گروہ یعنی اہل ایمان اور اہل صلاح کو خلافت ارضی سے سرفراز کیا ہے تاکہ اس زمین پر خدا کی تشریعی بادشاہت بھی اسی طرح قائم ہو جس طرح سے اس کی تکوینی بادشاہت قائم ہے۔ ہر انسان بالقوہ اللہ کا خلیفہ ہے کیونکہ اس کے اندر ایمان اور عمل صالح کی قوت پائی جاتی ہے لیکن بالفعل اللہ کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو ایمان و عمل صالح کا مجسم وجود بن چکا ہو، جو زمین پر آسمان کی مرضیات کو نافذ کر سکتا ہو، جو بندگانِ خدا کو خدا کے راستہ کی دعوت دے سکتا ہو، جو انسانی معاشرہ کے دینی اور دنیاوی مفادات کی حفاظت کر سکتا ہو، جو معاشرہ کی اصلاح کر سکتا ہو، امن قائم کر سکتا ہو، عدل و انصاف کا نظام چلا سکتا ہو، فتنہ و فساد کا انسداد کر سکتا ہو، قوانین اور حدود کو جاری و ساری کر سکتا ہو اور باغیوں کی سرکوبی بھی کر سکتا ہو، جس کے اندر امانت اور صداقت کی صفات پائی جاتی ہوں اور جو کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لئے پسینہ اور خون بہانے اور جان و مال کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو۔

یہ گروہ انسانی جو بالفعل مقام خلافت پر فائز ہوتا ہے وہ گروہ ہے جو اس زمین کا نمک ہے اور چشم فلک جس کے وجود کے انتظار میں بے قرار رہتی ہے جس سے مقصد حیات کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور تشریح بھی اور روح کائنات جس سے شاد آباد اور بامراد ہوتی ہے۔ یہی گروہ چمنِ انسانی کا گلِ سر سبد ہے۔ یہی جانِ بہار ہے۔ یہی بہار افروز اور بہار آفریں ہے۔ یہ گروہ نہ ہو تو دنیا بے مقصد ہے اور اس کے بغیر مخلوقات ارضی خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ اسی کی آمد آمد کے لئے دنیا سجائی گئی۔ زیوراتِ ارضی پھولوں کی شکل میں اس کے لئے مہکتے ہیں۔ زیوراتِ آسمانی

ستاروں اور سیاروں کی شکل میں اسی کے لئے چمکتے ہیں. نظام ارضی کی باگ ڈور اگر اس گروہ کے ہاتھ میں نہ ہو تو کائنات کا ذرہ ذرہ پکار کر کہتا ہے اے ناخواندہ اور غاصب مہمان ہم تیرے لئے نہیں اور تو میرے لئے نہیں ۔

اس گروہ انسانی کے وہ افراد جن کو شوریٰ حکومت چلانے کے لئے منتخب کرتی ہے بندگانِ خدا کو خدا کا راستہ دکھانا اپنا پہلا فرض سمجھتے ہیں. ساری دنیا کے انسانوں کو وہ دعوت حق کا مخاطب بناتے ہیں ان کو جہنم کی آگ سے بچانے اور جنت کے باغوں میں داخل کرنے کا مشن چلاتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اقامت نماز ان کا شعار ہوتا ہے پھر ان کے ذمہ امن و امان کا قیام ہوتا ہے کیونکہ اچھی حکومت کے لئے اور انسانی تمدن کی نشو و نما کے لئے امن پہلی شرط ہے. حضرت ابراہیمؑ کی دعا بھی یہی تھی رب اجعل ھٰذا البلد آمنا اور قرآن میں حکم ہے ولا تعثوا فی الارض مفسدین (زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو) حرث و نسل کی حفاظت اور نگہداشت ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

اس گروہ کے فرائض منصبی میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ نظام عدل کو قائم کرے اور اسے مستحکم بنائے۔ قرآن میں حکم ہے کہ واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ۔ ربعی بن عامر نے سرداران فارس کے دربار میں اسلام کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی ایک غرض لوگوں کو مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے انصاف میں داخل کرنا ہے۔ قرآن میں دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرنے کا حکم ہے اور کہا گیا ہے ان اللہ یحب المقسطین. اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے. ظلم سے نفرت اور ظالموں کے بارے میں وعید سے قرآنی آیات اور احادیث بھری ہوئی ہیں۔

اس گروہ کے بحیثیت خلیفہ فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ معاشرہ کو اخلاق و اقدار کے اعتبار سے ایک معیاری معاشرہ بنائے۔ ایسا معاشرہ جس میں اخوت و مساوات، اتحاد و اعتماد، ایثار و قربانی، ہمدردی اور نیکی اور شرافت اور امانت کی فضا پائی جائے. قتل و غارت گری نہ ہو۔ بداخلاقی اور جنسی انارکی نہ ہو. غیبت اور کذب و افتراء کا ماحول نہ ہو۔ جہاں راتیں عبادت اور تلاوت کے نور سے

جگمگاتی ہوں، جہاں دن رزق حلال کی کوششوں میں یا دعوت وجہاد کے کاموں میں یا تحصیل علم اور تسخیر قوت اور ایجادات وانکشافات کی مصروفیتوں میں گزارے جاتے ہوں ایسے معاشرہ کا ہر ذرہ ہیرا ہوتا ہے، ہر سنگ ریزہ نگینہ ہوتا ہے۔

فتنہ کی روک تھام اور شرک وکفر کا انسداد بھی اس گروہ کی بحیثیت خلیفہ کے ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کا بوجھ تو اصلاً دعوت کے ذریعہ اٹھایا جاتا ہے لیکن جہاد وقتال کی نوبت بھی آتی ہے۔ یہ جہاد کبھی تو اس صورت میں ہوتا ہے جب اہل کفر کی طرف سے پہل ہو لیکن اس صورت میں بھی حدود سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے۔

قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم	اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں
ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب	اور جنگ کرتے ہیں زیادتی نہ کرو بیشک اللہ
المعتدین۔	حدود سے تجاوز کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اگر کافروں نے حکومت اسلامی سے معاہدہ کیا ہو اور اس کے بعد معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہو تو ان سے بھی جنگ کرنا فرض ہوگا۔

وان نکثوا ایمانھم من بعد	اگر کفار معاہدہ کے بعد قسم کو توڑ دیں اور دین
عھدھم وطعنوا فی دینکم	کے بارے میں زبان طعن دراز کریں تو ان
فقاتلوا ائمۃ الکفر۔	ائمہ کفر سے قتال کرو۔

اگر کسی ملک میں مسلمان رہتے ہوں اور ان کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جائے تو اسلامی خلافت کا فرض ہوگا کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کے لئے قدم اٹھائے اور کافروں کی حکومت کے خلاف جہاد کرے۔

مالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ	تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد نہیں
والمستضعفین من الرجال والنساء	کرتے اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ کمزور مرد عورتیں
والولدان الذین یقولون ربنا	اور بچے ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے
اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم	پروردگار ہم کو اس بستی سے نکال جس کے

اهلها واجعل لنا من لدنك ولیا واجعل لنا من لدنك نصیرًا۔ — باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی حمایتی پیدا کر اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کسی کو مددگار بنا۔

کفار کے حملے کا اندیشہ ہو یا کافر مسلمانوں کو دین بدلنے پر مجبور کریں تو بھی ان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔

وحرض المؤمنین عسی اللہ ان یکف بأس الذین کفروا۔ — مسلمانوں کو جہاد کیلئے آمادہ کیجئے امید ہے کہ اللہ کافروں کے خوف کو روک دے۔

ولا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا۔ — آپ کافروں کا کہنا نہ مانیں اور اس (قرآن) کے ساتھ ان سے زبردست جنگ کریں۔

مسلمانوں کا جو طبقہ عوام کا ہے اور جن کو شوری نے حکومت چلانے کے لئے منتخب نہیں کیا ہے ان کی بھی بحیثیت خلیفہ یہ ذمہ داری ہے کہ وہ حاکم اور امیر کی اطاعت کریں۔ اصلاح معاشرہ کے کاموں میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں اور جب جنگ وجہاد کے لئے بلایا جائے تو اپنے آپ کو اس کے لئے پیش کریں۔ خلافت کا یہ نظام امیر اور مامور دونوں سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ امیر کا کام مامور کے حقوق و مصالح کی نگہداشت اور مامور کا کام امیر کی اطاعت اور کارِ حکومت میں تعاون ہے۔ قرآن میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا حکم موجود ہے۔ عوام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ بیجا اختلافات اور تنازع پیدا نہ کریں۔ اتحاد کا حکم منصوص حکم ہے اس لئے باہمی اتحاد کی ہر قیمت پر حفاظت ضروری ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا۔ — اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

لا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم۔ — آپس میں نہ جھگڑو کہ کہیں ناکام نہ ہو جاؤ اور تمہاری ہوا خیزی نہ ہو۔

اہم بات یہ ہے کہ عبادت اور خلافت دونوں کے تقاضوں کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ آیت

عبادت اور آیت خلافت دونوں کو ذہن نشین کر لینے سے دین کا صحیح اور متوازن تصور پیدا ہوتا ہے۔
دین کے متوازن تصور تک رسائی میں جو دشواریاں پیش آئی ہیں وہ ماحول کی پیدا کردہ ہیں۔ اسلام
میں دین کا تصور دوسرے مذاہب سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ دوسرے مذاہب میں کچھ رسوم
اور عبادات ہیں جن کا نام دین ہے ان کے دائرہ سے باہر جو کچھ ہے وہ دنیا ہے۔ یہی تصورات عام
انسانی زندگیوں میں پھیل گئے ہیں جن سے مسلمان بھی متاثر ہوتے ہیں چنانچہ ایک شخص اگر مسجد میں
بیٹھ کر ہر وقت ذکر میں مشغول رہتا ہے تو اسے لوگ بڑا متقی اور خدا ترس سمجھتے ہیں لیکن اگر ایک
شخص ایوان سیاست میں داخل ہو کر مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کو مضبوط بنانے کی کوشش
کرتا ہے تو دینی حلقوں میں اس کی سرگرمیوں کو دینی کام نہیں سمجھا جاتا چاہے وہ صوم وصلوٰۃ کا پابند
ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے اسلام کی اس خصوصیت کو ابتداء ہی سے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے
جو دنیا کے دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔ اسلام کے نظام زندگی میں دینی معاملات اور دنیوی
معاملات کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ اسلام میں کوئی کلیسائی یا پردھتی نظام نہیں پایا جاتا اسی طرح
دنیاداروں کا کوئی الگ طریقہ بھی نہیں بتایا گیا ہے دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام اور
مسلمانوں کی دنیوی سربلندی اور غلبہ کی کوششوں کا نام جہاد ہے یعنی اسلام ایک ایسا ہمہ گیر
مذہب ہے جس میں دنیوی معاملات کی تہذیب، تنظیم اور تعمیر بھی عبادت کے زمرہ میں داخل ہے۔
مقصد دین یہ ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق گزاریں۔
اس طرح وہ بہت ساری سرگرمیاں جو دوسرے مذاہب میں دنیوی سرگرمیاں سمجھی جاتی ہیں اسلام
میں دینی سرگرمیاں یعنی عبادت شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ جب مسلمان حلال کمائی میں مشغول
ہوتا ہے اور جب وہ ملت کا سیاسی محاذ پر یا عسکری محاذ پر یا علم کلام کے محاذ پر دفاع کرتا
ہے یا اسے زندہ اور فعال جماعت کی حیثیت سے قائم کرنے کی سعی کرتا ہے تو اگر اس کا یہ عمل
شریعت کی پابندی کے ساتھ ہے تو روزہ اور نماز ہی کی طرح دین ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبیؐ ج ۵ میں لفظ عبادت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

۱۔ عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت

اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے لیکن یہ عبادت کا نہایت تنگ مفہوم ہے "

۲۔ " عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے "

۳۔ " اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہتوں کو رکھ دے اور اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اسی وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے "

مولانا ابوالحسن علی ندوی جو حضرت مولانا الیاسؒ کی تحریک پر بھی کتاب لکھ چکے ہیں اور عبادات اور ارکان اربعہ پر ان کی کتاب مہتم بالشان کتاب سمجھی جاتی ہے۔ سیرت سید احمد شہیدؒ میں لکھتے ہیں:

" اسلام کا دنیا میں ایک مستقل نظام ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ بغیر حکومت کے قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کا پورا انتظام مالی و دیوانی و فوجداری معطل ہو جاتا ہے اس لئے قرآن غلبہ و عزت کے حصول پر بہت زور دیتا ہے اور اس خلافت اسلامی کو بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی اور اس کو اکابر صحابہ نے رسولؐ کی تجہیز و تکفین پر مقدم رکھا جس کو بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے "

بَابِ دُوم

متوازن تصوّر دین کے نفاذ کی کوششیں

اور

احتساب کے نمونے

متوازن تصورِ دین کے نفاذ کی کوششیں
اور
احتساب کے نمونے

خلافت راشدہ کا زمانہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا زمانہ ہے۔ اس وقت تک حکومت صرف محاصل و خراج کی وصولیابی کا ادارہ نہیں تھا بلکہ یہ اصلاً اور اولاً جمہور عوام کے عقائد کی درستی اور اعمال کی اصلاح امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دعوت الی اللہ کا ادارہ تھا اور اسی لئے اس کا نام خلافتِ راشدہ ہے۔ اس دور میں مال منافع کے بجائے دین اور اصول دین کو بالادستی حاصل تھی۔ یہ خلافت اور عبادت کی جامعیت کا زمانہ ہے، یہ سیاست اور دین کی یکجائی کا عہد ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی عہد کے نظام اجتماعی کا تسلسل ہے۔ خلفاء اور امراء بیت المال سے مال لینے کے بارے میں محتاط اور جزرس تھے۔ حکومت کسریٰ و قیصر کے نظام حکومت کی طرح موروثی نہیں تھی بلکہ شورائی تھی۔ دین کے متوازن تصور کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے بعد یہی زمانہ مثالی زمانہ قرار پاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خلافت کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن کے دلوں میں آخرت کا استحضار ہوتا ہے اور خشیت الٰہی کے تحت ان کے عمل کا صدور ہوتا ہے لیکن یہ درخشاں عہد چالیس سال سے زیادہ درخشانی نہ کر سکا اور اس کے بعد نقطہ انحراف کا آغاز ہوتا ہے اور خلافت شورائی کے بجائے موروثی ہو کر رہ جاتی ہے اور حکومت کا کام لوگوں کی ہدایت و ضلالت کی فکر کے بجائے مال گذاری کی تحصیل اور انتظام و انصرام تک محدود ہو جاتا ہے۔ خلافت تو باقی تھی لیکن علیٰ منہاج النبوۃ باقی نہیں تھی۔ گاڑی کو پٹری سے اترتا ہوا دیکھ کر کچھ لوگوں نے اپنے جان کی بازی لگا دی اور کچھ لوگوں نے باہمی کشت و خون سے اجتناب کرتے ہوئے اصلاح و تربیت کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی لیکن جن لوگوں نے جان کی بازی لگائی ان کو ہدف ملامت بنانا درست نہیں۔

دین و سیاست کی وحدت کی گاڑی اپنی پٹری سے چالیس سال کے بعد کس طرح اتر رہی تھی اس کا اندازہ ان واقعات سے بخوبی ہوسکتا ہے جو تاریخ میں مذکور ہیں۔

خلافت راشدہ کے عہد میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ خلیفہ وقت شعراء کی قصیدہ خوانیوں پر انعامات دے گا اور ان کو خلعت فاخرہ سے نوازے گا لیکن خلیفہ عبد الملک بن مروان کی مجلس میں اس دور کا مشہور عباسی شاعر اخطل بلا روک ٹوک آتا ہے اور اس شان سے آتا ہے کہ اس کی گردن میں سونے کی صلیب حمائل ہوتی ہے، جسم پر ریشم و خز کے کپڑے ہوتے ہیں، اور اس کی ڈاڑھی سے شراب کے قطرے ٹپکتے ہوتے ہیں۔

موسیقی کی تان پر شعر و نغمہ کی محفلیں اب منعقد ہونے لگی ہیں۔ عراق کا ایک بدنام مغنی حنین مدینہ آتا ہے اور جس گھر میں اس مغنی کا پروگرام ہوتا ہے وہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے چنانچہ لوگوں کے شوق ہجوم سے گھر کی چھت بیٹھ جاتی ہے اور یہ مغنی اس میں دب کر ہلاک ہو جاتا ہے۔

خلافت راشدہ میں نیکی کے کام رضائے الٰہی کے جذبہ سے کئے جاتے تھے لیکن اب شہرت و ناموری کے جذبہ سے کئے جانے لگے ہیں۔ عہد اموی کے دو عرب سرداروں حوشب اور عکرمہ کے درمیان اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ ہوتا ہے اور مہمان زیادہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حوشب کا پلڑا اکثر بھاری رہتا تھا۔ ایک مرتبہ عکرمہ نے اپنے حریف کو زک دینے کے لئے یہ تدبیر کی کہ صدہا بوریاں آٹے کی خریدی اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کر دیں کہ آٹا گوندھ لیا جائے۔ اس گوندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھر دیا اور اس پر گھاس ڈال دی اور اس کا انتظام کیا کہ حوشب کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا اس گڑھے میں گرا اور آٹے میں لت پت ہوگیا صرف اس کا سر باہر تھا چنانچہ دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں مہمانوں کے لئے کھانا اس مقدار میں بنتا ہے کہ گھوڑا گوندھے ہوئے آٹے میں گر کے ڈوب جاتا ہے چنانچہ شعراء نے عکرمہ کی تعریف میں قصیدے کہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ خود حضرت معاویہؓ کی تخت نشینی امت کے اعیان سے مشورت اور استمزاج کے ذریعہ نہیں ہوئی تھی بلکہ انھوں نے

اقتدار حاصل کرلیا تھا اور لوگوں نے بس ان کی اطاعت کرلی تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کی بیعت کے بعد مشہور صحابی اور فاتح عراق حضرت سعدؓ بن وقاص ان سے ملے تو انھوں نے السلام علیک یا یھا الملک کہہ کر خطاب کیا یعنی اے بادشاہ آپ کو سلام۔ حضرت معاویہؓ کو امیر المومنین کے بجائے ملک کہہ کر خطاب کرنا گوارا ہوا۔ لیکن ان کو خود بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ وہ مسلمانوں میں پہلے بادشاہ ہیں۔ بلا شبہہ حضرت معاویہؓ کا زمانہ فتوحات کے اعتبار سے اور اسلام کی وسعت و اشاعت کے اعتبار سے اور امن و امان کے اعتبار سے بہت خیر و برکت کا زمانہ ہے وہ صحابی رسولؐ اور کاتبِ وحی تھے اور زبردست انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اگر فوراً خلافتِ راشدہ کے بعد ان کا عہد نہ شروع ہوا ہوتا تو لوگ ان کی عظمتوں کے قصیدے پڑھتے اور سیاست و حکومت کے لئے ان کو نمونہ اور معیار سمجھتے لیکن سیاست و حکومت کا یہ چاند گہن میں اس لئے پڑ گیا کہ خلافتِ راشدہ کے دورِ زرّیں کے بعد فوراً وہ سریرآرائے سلطنت ہوئے۔

اگر یزید کی ولی عہدی کا واقعہ پیش نہ آتا جس کے عہد میں حضرت حسینؓ شہید کئے گئے اور ایک دو باتیں اور نہ ہوتیں تو ان کی حکومت کا زمانہ قابلِ مثال زمانہ قرار پاتا۔ وہ بڑے خدا ترس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عاشقانہ محبت رکھنے والے انسان تھے انھوں نے اپنی وصیت میں اہلِ خاندان سے کہا تھا کہ خدا کا خوف کرتے رہنا کہ خوف کرنے والوں کو خدا مصائب سے بچاتا ہے جو خدا سے نہیں ڈرتا اس کا کوئی مددگار نہیں پھر اپنے ذاتی مال میں سے آدھا مال انھوں نے بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دیا۔

تجہیز و تکفین کے متعلق یہ وصیت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ایک کرتا مرحمت فرمایا تھا اس کو میں نے اسی دن کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔ آپ کے موئے مبارک اور ناخن شیشہ میں محفوظ ہیں اس کرتے میں مجھے کفنانا اور ناخن اور موئے مبارک کو آنکھ اور منہ میں رکھ دینا شاید خدا اس کے طفیل میں اور اس کی برکت سے مغفرت فرمادے۔

یزید کی ولی عہدی کے نقصانات

حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے یزید کو جانشین نامزد کر دیا اس وقت صحابۂ کرام کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ یہ صحابۂ کرام کی اولاد واحفاد کا عہد تھا جن لوگوں نے حضورؐ کی حدیث سن رکھی تھی کہ میری سنت اور میرے راشد خلفار کی سنت کو دانتوں سے پکڑ کر رکھو، انھیں سیاست وحکومت کی سطح پر خلفائے راشدین کے زمانے سے یہ انحراف گوارا نہیں ہوا۔ جو روایت قائم ہوئی تھی اور جس روایت کو اختیار کرنے کا حکم حدیث میں موجود تھا اس اعتبار سے اہل تقویٰ اور اہلِ علم حکومت کو کسی شخص اور خاندان کی جائیداد نہیں سمجھتے تھے کہ باپ کے بعد بیٹا اس کا وارث ہو جائے۔ حکومت تو شہر اور ملک کا انتظام کرنے کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ یہ ایک اجتماعی کام ہے اور لائق ترین شخص کو یہ خدمت سپرد کی جانی چاہئے۔ اسلام کے اجتماعی نظام میں ملوکیت کے در آنے کے واقعہ کو ممکن نہ تھا کہ اہلِ دین کا ضمیر برداشت کرتا۔ اسلام کے نظام میں جو رخنہ پڑ گیا تھا اُسے پُر کرنے اور جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اس کی اصلاح کے لئے سب سے پہلی کوشش حضرت امام حسینؓ کی تھی۔ یہ کوشش ظاہری اور مادی اعتبار سے کامیاب ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو یہ واقعہ ہے کہ ہر دور اور ہر عہد میں اہلِ دین اور اہلِ عزیمت کو بگاڑ کے خلاف مقابلے اور مقاومت پر آمادہ کرتی رہی ہے وہ ایک غلطی جو یزید کی دلیعہدی کی شکل میں کی گئی تھی اس کا نتیجہ سینکڑوں سال تک مسلمانوں کو بھگتنا پڑا اور اسلام کی تاریخ میں ملوکیت کا یہ نظام ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفیٰ کمال کے الغائے خلافت تک بمشکل کوئی تزلزل ہو سکا۔ یہ تزلزل ہوا تو حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہدِ خلافت میں۔ ان کو یہ احساس تھا کہ یہ نظام جس کے ذریعہ بنو امیہ کے دور سے لوگ مسندِ اقتدار پر بیٹھے ہیں قیصر وکسریٰ کی سنت ہے اس میں مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد کے انتخاب کو دخل نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ اسلامی مزاج کے مطابق نہیں چنانچہ انھوں نے اس انحراف کی جس کی ابتدا یزید کی ولی عہدی سے ہوئی تھی اصلاح

ضروری سمجھی انھوں نے اپنی خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انتخاب کے معاملہ کو عوام کے سامنے دوبارہ پیش کرتے ہوئے کہا:

"لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لئے بغیر مجھے خلافت کی ذمہ داریوں میں بتلا کیا گیا ہے اس لئے میں خلافت سے دست بردار ہوتا ہوں اور تم جسے چاہو اپنا خلیفہ بنا لو۔"

سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد عہد نامہ کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کی بات طے ہو گئی تو وہ مسجد میں آئے اور منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا

ایھا الناس انی قد ابتلیت بہذا لامر غیر رأی کان منی ولا طلبۃ لہ ولا مشورۃ من المسلمین وانی قد خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی فاختذ والانفسکم نصاح الناس صیحۃ واحدۃ وقد اخترنا لک یا امیر المؤمنین ورضینا بک[1]	لوگو! مجھے (خلافت کی) آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔ اس میں نہ میری رائے شامل تھی اور نہ عام مسلمانوں سے مشورہ کرکے ایسا کیا گیا۔ میں اپنی بیعت کا قلادہ تمھاری گردنوں سے اتارتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ چن لو۔ لوگوں نے بیک آواز ہو کر کہا "امیرالمومنین ہم نے آپ کو ہی منتخب کیا اور ہم آپ کی خلافت سے راضی ہیں۔

مجمع نے آپ کی خلافت سے دست برداری قبول نہیں کی اور آپ کو اتفاق رائے سے خلیفہ منتخب کر لیا۔ اگر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نزدیک موروثی نظام بادشاہت مزاج دین کے خلاف نہ ہوتا تو بیعت کا قلادہ از خود کیوں اتارتے۔ افسوس ہے کہ ان کے بعد پھر سے جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا مستقل طریقہ چل پڑا۔ لوگ اجتماعی مشورے کے ذریعے برسر اقتدار نہیں آتے تھے بلکہ ہتھیاروں کی طاقت سے برسر اقتدار آتے تھے اور لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ بیعت سے اقتدار نہیں حاصل ہوتا تھا۔ بلکہ اقتدار سے بیعت حاصل ہوتی تھی اور جو بیعت نہیں کرتا اس کی گردن اڑا دی

---

[1] (ابن الجوزی ص ۵۳)

جاتی تھی۔ اسلام کی تاریخ کے اس طویل دور میں بلاشبہہ بہت سی برکتیں تھیں مقدمات کے فیصلے بھی اسلام کے نظامِ قضا کے ماتحت ہوتے تھے۔ لیکن خلافت علیٰ منہاج النبوۃ باقی نہیں رہی تھی۔

دینی طبقہ کی رائے عامہ

اسلام کی تاریخ میں جب اس سیاسی بدعت کا آغاز ہو رہا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ لوگ بھی خاموش رہ جاتے جنھوں نے نبوت کا زمانہ اور خلافتِ راشدہ کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ گروہ اگرچہ مختصر تھا لیکن یہ بات مزاجِ دین کے عین مطابق تھی کہ کچھ لوگ اس انحراف کو برداشت نہ کرتے اور اسے چیلنج کرنے کی ہمت کرتے۔ یزید کی حکمرانی سے علماء و صلحاء کا طبقہ اور اہلِ دین و تقویٰ کا گروہ حکومت سے دور ہوتا گیا دینی حلقوں میں نفرت و ناراضی بڑھتی جا رہی تھی۔

حضرت حسینؓ کا یزید کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنا دینی طبقے کی رائے عامہ کا مظہر اور بہت بڑی علامت تھا کسی نے اس اقدام کو غلط قرار نہیں دیا۔ حضرت حسینؓ کی شہادت پر پوری امت کا اتفاق ہے۔ تمام ائمۂ اہلِ سنت ان کے طرفدار اور حامی رہے ہیں۔

"امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ یزید کو پسند نہیں کر سکتا۔"[1]

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"جس شخص نے حضرت حسینؓ کو شہید کیا، ان کے قتل میں مدد کی یا ان سے راضی ہوا اس پر اللہ کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت، اللہ تعالیٰ نہ ان کے عذاب کو دور کرے گا اور نہ اس کا عوض قبول کرے گا۔"[2]

مجدد الف ثانیؒ کہتے ہیں:

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۴

[2] فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۴ صفحہ ۴۸۷

"یزید سعادت توفیق سے محروم اور زمرۂ فساق میں داخل ہے"[۱]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کہتے ہیں:

"گمراہی کی دعوت دینے والا شام میں یزید اور عراق میں مختار تھا"[۲]

عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد کی خرابیاں

نظام خلافت اور نظام ملوکیت دونوں میں بڑا فرق ہے اگر خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور اس کے بعد ملوکیت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو درج ذیل بین فرق محسوس کئے جائیں گے۔

(۱) خلافت راشدہ کے زمانے میں خلیفہ ایک عام فرد کی طرح بو دوباش رکھتا تھا۔ لیکن دمشق اور بغداد کے حکمرانوں نے ایران و روم کے بادشاہوں کی شاہانہ زندگی اختیار کر لی تھی جن پر بے دریغ دولت خرچ کی جاتی تھی۔

(۲) ملوکیت کے دور میں بیت المال رعایا کی امانت نہیں تھا۔ بلکہ وہ بادشاہ کی جاگیر اور ذاتی خزانہ بن گیا تھا۔ جب کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں خلیفہ اس بیت المال کا متولی ہوتا تھا اور خود اپنی ذات پر بھی اگر خرچ کرتا تھا تو کمالِ احتیاط اور تقوے کے ساتھ۔

(۳) خلافتِ راشدہ کے عہد میں لوگوں کو خلیفہ سے بھی محاسبہ کرنے کی آزادی تھی بلکہ اس محاسبہ کی بھی ہمت افزائی کی جاتی تھی ملوکیت کے دور میں بادشاہ ہر طرح کے احتساب اور محاسبہ سے بلند تھا اور حق گوئی کی جرأت کرنے والے کی سزا قتل یا قید ہو سکتی ہے۔

(۴) خلافتِ راشدہ کے دور میں عدلیہ آزاد تھی قاضی خلیفہ تک کو عدالت میں طلب کر سکتا تھا اور خلیفہ کے خلاف فیصلہ دے سکتا تھا۔ ملوکیت کے دور میں عدالتیں بادشاہوں کے دباؤں سے بالکلیہ آزاد نہ تھیں۔

(۵) خلافتِ راشدہ میں تمام اجتماعی کام صلاح و مشورے یا شورائی نظام کے ذریعہ انجام دیے جاتے تھے۔ ملوکیت کے دور میں بادشاہ مطلق العنان ہوتے تھے اور "وامرھم شوریٰ بینھم" کے حکم شریعت کو پامال کیا جاتا تھا۔

(۶) خلافتِ راشدہ کے دور میں خلفاء کی زندگی طہارت و تقویٰ کا بلند ترین نمونہ پیش کرتی تھی ملوکیت کے دور میں فسق و فجور، ہوا و ہوس، نوش و نشید کا سیلاب شاہی دربار میں

---

[۱] مکتوبات امام ربانی جلد ۱ مکتوب ۲۵۱

[۲] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ ۲۱۳

تک پہنچ گیا تھا۔ خود یزید کی زندگی بے داغ نہ تھی۔ آبرو فاختہ اور ایاحیت زدہ مصاحبین کا گروہ خلفاء کے دربار میں پایا جاتا تھا جبکہ اس طبقہ کا وجود خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں نہ تھا

(۷) حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا کتاب وسنت کے بجائے ذاتی مفادات یا ملکی مصالح بن گیا تھا۔ ملکی اور مالی مفادات کے لیے دین کو قربان کیا جاتا تھا اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جاتی تھی اس کی مثال یہ ہے کہ بنو امیہ کے عہد میں نومسلموں تک سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا تاکہ حکومت کا خزانہ بھرا رہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس خلاف شرع آرڈیننس کو ختم کیا اور یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بناکر بھیجے گئے تھے جابی (ٹیکس وصول کرنے والا) بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔

(۸) اقربا نوازی اور کنبہ پروری اور دوسری اخلاقی خرابیاں جو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سخت معیوب تھیں عام ہوگئیں۔

(۹) خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں حکمراں کا تعلق خاص قبیلہ اور نسل سے نہ تھا دورِ ملوکیت میں جب کسی قبیلہ کا شخص حکمراں ہوجاتا تھا اور کئی نسلوں تک اقتدار اس کے قبضہ میں رہتا تھا تو نسلی عصبیتوں کو بڑھاوا دیتا اسلام سے پہلے ہر قبیلہ کا بت الگ ہوتا تھا۔ اسلام نے قبائلی عصبیتوں کو مٹاکر وحدت امت کا نصب العین عطا کیا تھا لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد قبائلی عصبیتیں زندہ ہوئیں۔ جب مسلمانوں کے فتوحات کے قدم بعد میں اسپین تک پہنچے تو قبائلی عصبیتوں نے وہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا اور قبائل کی الگ الگ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں جو باہم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی ہوتی تھیں بلکہ ایک دوسرے کے خلاف یہودیوں اور عیسائیوں تک سے مدد لی جاتی تھی۔ پھر قبائلی تعصبات کی آگ ہی نہیں بھڑکی بلکہ عرب وعجم کی کشمکش بھی شروع ہوگئی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد ایک مدت تک عرب سامراجی نظام پایا گیا جس کا ردِّ عمل غیر عرب مسلمانوں پر ہوا۔

(۱۰) خلافتِ راشدہ کے دور میں کلمہ حق کہنے اور خلیفہ تک کو برسرِ عام ٹوکنے کی لوگ ہمت رکھتے تھے اور خلیفہ کو اپنی صفائی پیش کرنی پڑتی تھی۔ اس کے بعد ملوکیت کے دور میں حق بات کہنے کا مطلب کبھی اپنی جان سے اور کبھی عاقبت کی زندگی سے ہاتھ دھونا تھا۔ ضمیر کو

کھلنے کے لیے اورامر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے رد کنے کے لیے حکومت کی طرف سے عہدہ د منصب کی بخشش شاہانہ پیش کی جاتی اور علماء دین ان مناصب کو رشوت سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کے نتیجہ میں وہ حکمرانوں کی زجر و توبیخ اور ایذارسانی کا شکار رہتے تھے جب امام مالک نے خلفاء کی جبری بیعت کے کالعدم ہونے کا فتویٰ دیا تو ان کی پیٹھ پر تازیانے برسائے گئے۔

خلاصہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے نظام حکمرانی کو ختم کرکے عجمی ملوکیت کے موروثی نظام کو اختیار کرنے کے جو مفاسد ہو سکتے تھے وہ سب کے سب پیدا ہونا شروع ہو گئے اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

"زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی تھی اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی تھی"

جن صحابہ کرام نے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی ان کا بیعت سے انکار کرنا دراصل اسلامی نظام میں ان ہی آنے والے انحرافات کو روکنے اور ان پر پابندی لگانے کے لئے تھا۔ ان کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اگر اصلاح نہ ہوئی تو یہ بگاڑ بڑھتا ہی جائے گا یزید کی ولی عہدی کے وقت یہ بگاڑ اگرچہ پورے طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن جن لوگوں نے خلافت کو ہرقل کی ملوکیت میں تبدیل کر دینے پر تنقید کی تھی اور اپنی ناراضی ظاہر کی تھی انھیں پورے طور پر یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اسلامی ریاست کی گاڑی نے اپنی پٹڑی بدل دی ہے اور اب یہ راستہ "مکہ" کے بجائے "ترکستان" کی طرف جا رہا ہے۔ منزل اور سمت سفر کی اس تبدیلی کے نتائج سے وہ لوگ اچھی طرح واقف تھے جن کو اللہ نے نورِ بصیرت عطا فرمایا تھا حضرت امام حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے مستقبل کے خطرات کا اندازہ کیا اور سمتِ سفر کی اس تبدیلی کو روکنے کے لئے اپنی زندگی قربان کر دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو خلافت کے لئے ذاتی استحقاق کے لیے میدان میں نہیں آئے تھے۔ یہ امت کے بہترین لوگ تھے۔ حضرت حسینؓ نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ حضرت اسما بنت ابوبکرؓ تھیں اور خالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ۔

اختلاف کی بنیاد

تاریخ کی کتابوں میں ان اجلِ صحابہ کے نام موجود ہیں جنھوں نے یزید کے لیے بیعت کرنے سے انکار کیا۔ حضرت حسینؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نام تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ نظامِ حکومت اپنے اسلامی مزاج سے منحرف ہو رہا تھا۔ اور خلفائے راشدین کے بجائے اسلام میں قیصر و کسریٰ کی سنت زندہ کی جا رہی تھی۔ اس تبدیلی کو اہلِ دین اور صحابۂ عظام کا دینی ضمیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یزید کی ولیعہدی کے مسئلے پر ابنِ اثیر نے اختلاف کی جو روداد سنائی ہے۔ اس میں مروان کے سامنے عبدالرحمان بن ابوبکرؓ کا بیان موجود ہے۔ اس بیان سے اختلاف کی اصل بنیاد کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔

"تم لوگوں کی نیت یہ ہے کہ خلافت کو ہرقل کی لوکیت سے بدل دو کہ ایک ہرقل مرا تو دوسرا ہرقل آ گیا"[1]

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حضرت معاویہؓ کو یزید کی ولیعہدی کے موقع پر یہ مشورہ دیا تھا کہ خلافت کے اہم مسئلے میں خلافت راشدہ کو نمونہ بنائیے نہ کہ دنیا کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو۔ یزید کی ولیعہدی سے شدید اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے حضرت معاویہؓ کو کہا:

"اپنے بعد معاملے کو اس طرح چھوڑ جائیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے کہ انھوں نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا اور لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو منتخب کیا، یا پھر حضرت ابوبکرؓ کی سنت اختیار کیجئے کہ خلیفہ نامزد تو کیا مگر اپنی اولاد کو نہیں، نہ اپنے خاندان میں سے کسی کو۔ یا خلیفہ ثالث حضرت عمرؓ کی طرح کیجئے کہ انھوں نے خلیفہ کے انتخاب کے لئے شوریٰ بنا دی تھی مگر اس میں اپنے خاندان یا اولاد کے کسی فرد کو نہیں رکھا"[2]

خود حضرت حسینؓ کا قول تاریخ میں موجود ہے۔ امام وہی ہے جو کتاب اللہ پر عامل انصاف کا خوگر، حق کا تابع اور تعلق مع اللہ کے صفت سے متصف ہو[3]

---

[1] ابن اثیر جلد ۳ صفحہ ۲۵۰ [2] ابن اثیر [3] طبری جلد ۴ صفحہ ۱۹۸

اب جن لوگوں نے بر سرِ ممبر اور علیٰ رؤس الاشہاد یزید کی خلافت کو ماننے سے انکار کیا تھا، ان کے نزدیک یزید نہ کتاب اللہ پر عامل تھا نہ انصاف کا خوگر نہ حق کا تابع اور نہ تعلق مع اللہ کی صفت سے متصف ۔ یزید کا کردار کیا تھا ۔ البدایہ والنہایہ جیسی قابلِ اعتماد کتاب میں اور دوسری بہت سی تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے ۔

چنانچہ علامہ ابن کثیر اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں

وکان فیہ ایضاً اقبال علی الشہوات والترك لبعض الصلوات فی بعض الاوقات واماتتہا فی غالب الاوقات	اس کے ساتھ اس میں شہوات کی طرف میلان موجود تھا ۔ کبھی وہ تارک الصلوٰۃ بن جاتا تھا ۔ نمازوں کے معاملے میں وہ نہایت لاپرواہی کا شکار تھا ۔

اسلامی حکومت کا مقصود ہی اقامتِ نماز ہے ۔ اگر کوئی حکمران دین کے معاملہ میں اتنا لاپرواہو جائے کہ اسے نمازوں کی بھی فکر نہ رہے اور اقامت صلوۃ کے بجائے اماتت صلوۃ کا مجرم بن جائے تو پھر اس کے لئے کوئی ڈھال باقی نہیں رہتی اور اس کے خلاف اقدام درست ہو جاتا ہے

حضرت معاویہؓ کا موقف

اس سوال کا پیدا ہونا قدرتی ہے کہ حضرت معاویہؓ جیسی اہم شخصیت کو یزید کی ولیعہدی پر اصرار کیوں تھا اور یہ اجتہادی غلطی ان سے کیوں سرزد ہوئی تاریخ کہتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ امت کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لیے یہی صورت مناسب تھی ۔ اس کے علاوہ یزید میں وہ انتظام و انصرام اور قوت و بہادری کے جوہر بھی دیکھتے تھے ۔ اور یہ جوہر عام طور پر دنیا میں بادشاہوں کے لڑکوں میں پائے جاتے ہیں لیکن تاریخ یہ بھی کہتی ہے کہ ان سب کے ساتھ اس محبت کا جذبہ بھی کام کر رہا تھا، جو ہر باپ کے سینے میں ہوتا ہے ابن کثیر نے اسبابِ ولیعہدی میں اس سبب کو سب سے پہلے بیان کیا ہے

"وذالك من شدة محبة الوالد لولده"

صحابہ کرام کا روکنا بربنائے مصلحت وشفقت

جن بزرگوں نے حضرت حسینؓ کو اقدام سے روکنے کی کوشش کی ان کا نقطۂ نظریہ نہیں تھا کہ حکومت اور سیاست میں بگاڑ پر نکیر کرنا اور مخالفت میں قدم اٹھانا ہی سرے سے غلط ہے۔ بلکہ نقطۂ نظریہ تھا کہ حالات کا اور اپنے دشمن کی قوت کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے۔

حضرت حسینؓ کے سوتیلے بھائی محمد بن حنیفہ نے ان سے کہا

"تمام علاقوں میں گھومئے پھرئے تاکہ اندازہ لگ سکے کہ حالات کیا ہیں اور لوگوں کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ لوگوں سے ملنے کے بعد جو رائے قائم ہوگی وہی صحیح رائے ہوگی"[1]

حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی مشورہ دیا کہ ابھی مقابلے کے لئے اٹھنا قرینِ مصلحت نہیں انھوں نے کہا:

"عراق کا ارادہ نہ کرو اور اپنی جان کھونے کے لئے وہاں نہ جاؤ۔ کم از کم اتنی بات مان لو کہ موسمِ حج گزر جانے دو۔ حج میں آنے والے لوگوں سے مل کر وہاں کے حالات کا اندازہ کرو اور پھر جو طے کرنا ہے طے کر دو"

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ ان حضرات کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ وقت ابھی سازگار نہیں ہے۔ آج یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے حالات کا اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ اس وقت قطعیت کے کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا اور کوفے کے عمائدین کے بے شمار خطوط کو انھوں نے اپنے موقف کے لیے دلیل بنایا تھا۔ انھوں نے اخلاص کے جس موقف کو صحیح سمجھا اسے اختیار کیا۔

حضرت حسینؓ کی مخالفت بڑے فنکارانہ طریقہ سے ہو رہی ہے اور بڑی چابک دستی کے ساتھ یزید کی صفائی پیش کی جارہی ہے تاثر یہ دیا جارہا ہے کہ ایک دو بزرگوں کو چھوڑ کر کوئی یزید کا مخالف نہ تھا باستثنائے چند سب نے بطیب خاطر یزید کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا اور یزید میں کوئی ایسی خرابی نہ تھی کہ اس کو خلیفہ تسلیم کرنے میں کوئی قباحت لازم آتی اس اس بارے میں جو بات کہ بار بار دہرائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت

---

[1] (طبری جلد ۶ صفحہ 191)

عبداللہ بن عباسؓ نے نہ صرف یہ کہ بیعت کر لی بلکہ بیعت کی مخالفت کرنے والوں کو نصیحت بھی کرتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس یہ دونوں بزرگ شروع سے یزید کی ولی عہدی اور یزید کی خلافت کے مخالف تھے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلام کا اجتماعی ڈھانچہ بدل رہا تھا اور جو سیاسی نظام شروع ہوا تھا وہ منہاج سنت پر مبنی نہیں تھا اور یہ بات صحابہ کرام اور اہلِ دین و تقویٰ کے لئے بڑی صبر آزما تھی۔ لیکن یہ حضرات دیکھ رہے تھے کہ اس صورتِ حال کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ شام کے قشونِ قاہرہ کی نظروں میں نہ اہلِ دین کا تقدس ہے نہ دین کا احترام اور نہ خود اس کی دینی تربیت ہو سکی ہے۔ مذہب اور سیاست کے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ اب ہتھیار ڈالنے اور بدرجہ مجبوری بیعت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی علاقہ میں گورنر کو بھیجتے تھے تو نرمی اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن کی گورنری پر مامور کیا تو نصیحت کی "یسّروا لاتعسّروا"، نرمی اور آسانی پیدا کرنا سختی نہ کرنا یہی طریقہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں بھی تھا۔ لیکن بنوامیہ کے زمانے کے گورنر تمام دینی تقاضوں کو فراموش کر کے ظلم پر ہر وقت کمربستہ رہتے تھے حجاج کے مظالم کو دیکھ کر حسن بصریؒ نے فرمایا:

"اے اللہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں جو تجھ سے نہیں ڈرتا"

ظلم و ستم کی خونچکاں داستان جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان حالات میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسی شخصیت جس کے روز و شب تسبیح و تلاوت اور مسلسل عبادت میں گزرتے ہوں مجبوراً بیعت کر لیتے ہوں اور اسی طرح سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ آخر میں آمادۂ بیعت ہو جاتے ہوں تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان حضرات کے طرزِ عمل کو حضرت حسینؓ کے اقدام کو غلط ثابت کرنے کے لیے دلیل بنا کر پیش کیا جائے اور اللہ کی مخلوق کو گمراہ کیا جائے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اہلِ دین کی اکثریت نے اس وقت کے حالات میں جو ممکن ہو سکا وہ کیا۔ انھوں نے حکومتِ وقت سے قطع تعلق کر لیا اور گوشہ گیر ہو گئے اور اپنے اپنے دائرہ میں تجدید و احیاء کی پرخلوص جدوجہد شروع کر دی تاکہ دینی اور اخلاقی نظام پر سیاسی نظام کی غلط کاریوں

کا سایہ کم سے کم پڑے انھوں نے بادِ مخالف کے جھونکوں کے درمیان شمع روشن کی۔

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بے کار گریباں تو مرا دور نہیں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ باوجود بیعت کر لینے کے یزید کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس پر وہ مراسلت بہترین شہادت ہے جو ان کے اور یزید کے درمیان ہوئی تھی شہادت حسینؓ کے بعد جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی بیعت خلافت کی دعوت دی تو اس دعوت کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے قبول نہیں کیا۔ ان حضرات نے اگرچہ بادل ناخواستہ بیعت کر لی تھی لیکن بیعت کر لینے کے بعد وہ اس کو توڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے انکارِ بیعت سے یزید بہت خوش ہوا اور اس نے اپنے خط میں انعام و اکرام اور حسنِ سلوک کا وعدہ کیا۔ یزید کا خط ابنِ اثیر کی تاریخ میں موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے یزید کو اس کے خط کے جواب میں لکھا:

"تمھارا خط ملا، میں نے جو ابنِ زبیر سے بیعت نہیں کی تو واللہ اس سلسلہ میں تم سے حسن سلوک اور تمھاری تعریف کا خواہاں نہیں بلکہ جس نیت سے میں نے ایسا کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ تمھارا یہ کہنا کہ تم میرے اس حسنِ سلوک کو فراموش نہ کرو گے تو مجھے تمھارے حسنِ سلوک کی ضرورت نہیں اور تمھاری یہ درخواست کہ میں دلوں میں تمھاری محبت پیدا کر دوں اور ابنِ زبیر سے نفرت اور ابن زبیر کو میں اکیلا چھوڑ دوں تو ایسا نہیں ہو سکتا مجھے نہ تمھاری خوشی منظور ہے اور نہ تمھارا اعزاز اور یہ ممکن بھی نہیں کیونکہ تم ہی حسینؓ اور جوانانِ عبدالمطلب کے قاتل ہو۔ تمھارے سواروں نے تمھارے حکم سے ان لوگوں کو خون آلود میدان میں ڈال دیا تھا اور ان کے بدن پر ایک کپڑا بھی نہ تھا۔ پیاس کی حالت میں ان کو قتل کیا گیا...... یہ سب کچھ تم نے خدا، رسول اور اہلِ بیت کی عداوت میں کیا۔ حسینؓ نے تمھارے سامنے

صلح کی بھی پیش کش کی اور واپس لوٹ جانے کی بھی درخواست کی مگر تم نے یہ دیکھ کر کہ اس وقت بے یار و مددگار ہیں اور ان کے خاندان کا صفایا کیا جا سکتا ہے موقع غنیمت جانا اور تم ان کے خلاف اس طرح ٹوٹ پڑے گویا تم مشرکوں اور کافروں کو قتل کر رہے ہو .... آج تو نے ہم پر فتح پائی ہے ہم بھی کسی نہ کسی دن تجھ پر فتح پا کر رہیں گے

والسلام[1]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے یہ الفاظ روز روشن کی طرح یہ شہادت دیتے ہیں کہ اس وقت کے عالم اسلام کا دینی حلقہ یزید کو ناپسند کرتا تھا۔ اس دینی حلقہ نے حضرت امام حسینؓ کے سرفروشانہ اقدام کا عملی ساتھ دیا ہو یا نہ دیا ہو اس حلقہ کا دل ان کے ساتھ تھا۔ جن لوگوں نے روکنے کی کوشش کی وہ بربنائے شفقت کی تھی کہ اہلِ اسلام کے اس کعبہ محبت کو کوئی آنچ نہ آئے یا اس لئے تھی کہ ان کے خیال میں اقدام کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں۔ آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے حالات کا اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ لیکن اس وقت قطعیت کے ساتھ ان کے لئے ناسازگاری کا فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ کوفے کے عمائدین کے خطوط ان کے پاس آ رہے تھے۔ وفود کی شکل میں لوگ آ رہے تھے اور انھیں بلا رہے تھے۔ انھوں نے اگر یہ فیصلہ کیا کہ انھیں نکلنا چاہئے تو کیوں اسے غلط کہا جائے کیا یزید کی حکومت کے خلاف بے چینی موجود نہیں تھی کیا خلافت کو موروثی نظام سے بدلنے پر اضطراب نہیں پایا جاتا تھا؟۔

حکمت الٰہی کیا تھی؟

علامہ ابن تیمیہ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ حکمت الٰہی یہ تھی کہ امام حسینؓ کو شہادت کے بلند و ارفع مقام تک پہنچایا جائے تاکہ وہ شہدار کا عیش اور سعدار کی منزل پا سکیں۔

---

[1] ابن اثیر کامل - ج ۴ ص ۵۰/۵۱

لیکن اس حکمتِ الٰہی سے بڑھ کر ایک اور حکمت الٰہی اس واقعہ شہادت میں موجود ہے جس کا رشتہ پوری ملّت اسلامیہ کے مستقبل کی تاریخ سے جڑا ہوا ہے اور وہ یہ کہ حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سرفروشانہ اقدام کے ذریعہ غلط اور فاسد اقتدار کے خلاف اعلانِ حق کی ایک زندہ نظیر باقی رہ جائے جو ہر دور میں اہلِ عزیمت کے لئے نمونہ کا کام کرے اور فساد کو مٹانے کے لئے انھیں بے چین و مضطرب کر دے۔ یہاں امام ابن تیمیہ ہی کے قول کو پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"دین کے اعزاز و غلبے کے لئے جانوں کو خطرے میں ڈالنا دین میں مشروع ہے"

حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت اہلِ عزیمت کے لئے نمونہ اور نظیر۔

بظاہر یزید کے زمانہ کی دونوں کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ لیکن یہ کامیابی کیا کم ہے کہ یہ دونوں کوششیں اہلِ عزیمت کے لئے نمونہ اور نظیر کا کام دیتی رہیں۔ اور اہل دین و صلاح کی نظروں میں اسلامی سیاست و خلافت کی آئیڈیل شکل ہمیشہ باقی رہی اور اس کے لئے جدوجہد بھی جاری رہی۔ جدوجہد اس چیز کے لیے تھی کہ خلافت کو صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اسلامی نظامِ حکومت کی چول جو کھسک گئی تھی اسے اپنی جگہ پر بٹھایا جائے۔ اور یہ اجارہ داری جو امویوں نے اور عباسیوں نے قائم کرلی تھی اسے ختم کیا جائے لیکن اموی اور عباسی حکومتیں طاقتور حکومتیں تھیں۔ ان کی پشت پر مضبوط فوجی نظام تھا ان حکومتوں کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ ان کے مقابلہ میں کچھ حمایت اگر مل سکتی تھی تو ان لوگوں کو جو ایک طرف اپنے زہد اور تقویٰ کے اعتبار سے اور دوسری طرف علو نسب اور خاندانی شرافت کے اعتبار سے سوسائٹی میں غیر معمولی احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہوں یہی وجہ ہے کہ موروثی نظامِ حکومت کے خلاف علمِ جہاد اٹھانے والے اس دور میں وہ لوگ تھے جن کا تعلق اہلِ بیت سے تھا کہ ان کی کامیابی کا امکان دوسروں کے مقابلہ میں

زیادہ تھا اور معاشرہ میں ان کی حیثیت مرکز امید کی تھی۔

امام حسینؓ کے پوتے حضرت زید بن علی بن حسین نے ہشام بن عبدالملک کے خلاف محاذ آرائی کی اور ۱۲۲ھ میں اقامتِ دین کی اس جد و جہد میں شہادت سے سرخرو ہوئے۔ اگر یہ اقامتِ دین کے لئے جد و جہد نہ ہوتی اور یہ کشمکش جہاد نہ ہوتی تو امام اعظم ابوحنیفہؒ ان کے مؤید اور حامی نہ ہوتے۔ امام صاحب کی تائید اور حمایت اسی لئے تھی کہ وہ اس موروثی نظامِ حکومت کو غیر شرعی اور غیر اسلامی تصور کرتے تھے۔ انھوں نے زید بن علی کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے اور اس استفسار پر کہ یہ جہاد ہے کہ نہیں یہ ارشاد فرمایا کہ یہ بھی ایک طرح کا جہاد ہے جس طرح واقعہ بدر جہاد تھا

"خروجه يضاهي خروج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم بدر وامد جنوده بالمال ولكنه كان ضعيف الثقة في انصاره ولذا قال في الاعتذار عن حمل السيف معه"

زید بن علیؓ کا خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کے خروج کے مماثل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے زید بن علی کی فوج کی مالی معاونت کی لیکن چونکہ حضرت زید کے حمایتیوں پر انھیں بھروسہ کم تھا اس لئے انھوں نے تلوار اٹھانے سے معذرت کی۔[1]

حضرت زید بن علیؒ کے بعد حضرت محمد ذو نفس زکیہ بن عبداللہ المحض بن حسن مثنی بن سیدنا حسنؓ نے مدینہ طیبہ میں اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ المحض نے کوفہ میں عباسی خلیفہ منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور امام ابوحنیفہؒ امام مالک نے ان کی بھی تائید و حمایت کی امام ابوحنیفہؒ نے مالی مدد کی۔ امام مالکؒ نے اہلِ مدینہ کو محمد ذو النفس الزکیہ کی رفاقت و طاعت کا فتویٰ دیا اگرچہ کہ لوگ منصور کی بیعت کر چکے ہوں۔[2]

یہ بحث غیر ضروری ہے کہ یہ کوششیں کتنی کامیاب ہوئیں اور کتنی نہیں، انسان صرف

---

[1] (مناقب امام ابوحنیفہ لبزازی بحوالہ ابی زہرہ ص ۱۶۴)

[2] تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۱۴

اپنی کوششوں کا مکلف ہے ان کے نتائج کا نہیں ۔ یہ دنیا صرف دار العمل ہے ۔ کوششوں کی جزار کی اصل جگہ آخرت ہے ۔ اس دنیا میں اہلِ حق صلحار بلکہ انبیار کو بھی کامیابی کبھی ملتی ہے اور کبھی نہیں ۔ دنیوی نتائج کا تعلق اللہ تعالیٰ کی وسیع تر مصلحتوں سے ہے اور تنہا وہی ان مصلحتوں کا جاننے والا ہے ۔ لیکن ان کوششوں کی یہ کامیابی بھی کم نہیں کہ ان کی وجہ سے باطل کے خلاف مزاحمت اور سلطان جائر کے خلاف کلمہ حق کہنے کی ایک پوری تاریخ وجود میں آئی ہے ۔ اسلامی تاریخ کی آبرو ان سے قائم ہے جنھوں نے مضبوط ترین طاقتوں کے مقابلہ میں بھی سپر نہیں ڈالی اور بلند ترین مقصد کے لئے انھوں نے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے سے دریغ نہیں کیا ۔

صحابہ کرام کی تربیت اور تعلیم سے تیار ہونے والے علمار اور فقہار دین بھی کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام سے غافل نہیں رہے ۔ انھوں نے حق کی پرواہ کی اور جان کی پرواہ نہیں کی جب عبد الملک نے اپنے دو بیٹوں کو یکے بعد دیگرے جانشین بنانا چاہا تو مشہور تابعی سعید بن مسیب نے مخالفت کی اور قید و بند کی تکلیفیں اٹھائیں اور کوڑے کھائے ۔ حجاج نے جب بصرہ اور کوفہ کے نومسلموں پر جزیہ لگایا تو علمار نے شدید مخالفت کی اور جب عبد الرحمان بن اشعث نے حجاج کے مظالم کے خلاف بغاوت کی اور امر بالمعروف کا علم بلند کیا تو علمار کی بڑی تعداد نے جن میں سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی اور شعبی جیسے بزرگ شامل تھے، عبد الرحمان کا ساتھ دیا اس حق پسندی کی وجہ سے سعید بن جبیر کو جام شہادت نوش کرنا پڑا اس بغاوت کے سلسلہ میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام شعبی جیسے علمار نے جو حکومت کے ساتھ تعاون کرتے تھے، باغیوں کا ساتھ دیا ۔ ملوکیت کے اس عہد کے بارے میں امام حسن بصریؒ کہا کرتے تھے

> "امرار کی تلواریں ہماری زبانوں سے آگے بڑھ گئی ہیں ۔ جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہمیں تلوار سے جواب دیتے ہیں ۔"

امام غزالی نے علمار حق کی بے خوفی اور حق گوئی کے واقعات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے

ھذہ کانت سیرۃ العلماء و	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں علمار کا یہی
عادتھم فی الامر بالمعروف	دستور اور طریقہ تھا وہ بادشاہوں کی سطوت

والنهی عن المنکر و قلتہ مبالاتہم بسطوۃ السلاطین لکنہم اتکلوا علی فضل اللہ تعالی ان یحرسہم ورضوا بحکم اللہ تعالی ان یرزقہم الشہادۃ۔

اور طاقت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انھیں اللہ کی رحمت پر بھروسہ تھا کہ وہی ان کا نگراں اور محافظ ہے۔ وہ خدا کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ انھیں شہادت نصیب ہو[1]

ایک بنیادی مسئلہ اور شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ

جمہور علماء اہلِ سنت حضرت حسینؓ کے اقدام کو درست اور ان کے موقف کو حق سمجھتے ہیں۔ شیعیت کے خلاف محاذ آرائی میں حضرت امام حسینؓ کے اقدام کو ہی غلط ثابت کرنے کی کوشش بڑی غلطی ہوگی۔ یہ مسلک اہلِ سنت والجماعت کا نہیں ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب منہاج السنۃ میں یہ لکھا ہے کہ یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کا اقدام درست نہ تھا یہاں منہاج السنۃ کے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جو حضرت حسینؓ کے برسرِ حق ہونے سے انکار کرنے والوں کا بہت بڑا سہارا بن گئے ہیں۔

(۱) یہ بات جان لینے کی ہے کہ صحابہ کرام کا طبقہ ہو یا تابعین عظام کا یا بعد کے زمانوں کے اہلِ بیت یا غیر اہلِ بیت کا ان میں سے بڑے بڑے اہلِ علم و دین سے بعض وقت ایسی نوعیت کا اجتہاد سرزد ہو جاتا ہے جن میں کچھ ظن و وہم اور کبھی کوئی باریک قسم کی ہوائے نفس شامل ہو جاتی ہے۔ ایسا اجتہاد اس شخصیت کی عنداللہ عظمت کے باوجود قابلِ اتباع نہیں ہوتا۔"

(۲) "مسلمانوں کے اکابر اہلِ علم نے ہمیشہ ان خرابیوں کی مخالفت کی ہے مثلاً یزید کے خلاف اہلِ مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو عبداللہ بن عمرؓ سعید بن مسیب اور علی بن الحسین (زین العابدین) نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ یا ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اٹھا تو حسن بصری اور مجاہد وغیرہ نے سمجھایا لہٰذا اہلِ سنت کے یہاں یہ مسئلہ بالکل طے شدہ

[1] (احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۵۱ باب امر بالمعروف والنہی عن المنکر)

ہو چکا ہے کہ فتنے کے وقت میں تلوار اٹھانا مناسب نہیں. علماء اہل سنت نے اس مسئلہ کی اس درجہ اہمیت سمجھی ہے کہ اسے عقائد کی فہرست میں داخل کر کے لازم کیا ہے کہ ائمہ و خلفاء کے جور و ستم کا مقابلہ تلوار کے بجائے صبر اور برداشت سے کیا جائے ..... یہی وجہ تھی کہ حب حسینؓ نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو اکابر اہل علم و دین مثلاً ابن عمرؓ ابن عباسؓ ابو بکر بن عبدالرحمان بن حارث بن ہشام نے اس ارادہ کے خلاف مشورہ دیا۔[1]"

علامہ ابن تیمیہ کے ان اقتباسات کے بارے میں ایک خیال تو یہ ہے کہ ان کی حیثیت الزامی جواب کی ہے کیونکہ منہاج السنۃ ایک شیعی عالم حسین بن مطہر کی کتاب منہاج الکرامہ فی معرفۃ الندامۃ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں ان کی حیثیت اہل سنت کی طرف سے وکیل کی ہے۔ لیکن یہ اگر ان کے واقعی خیالات ہیں تو وہ اپنے خیالات میں منفرد اور تنہا ہیں اور ان کے بہت سے شاذ افکار کی طرح یہ بھی ان کا شذوذ ہی ہے اور جس طرح سے ان کے بہت سے خیالات اور نظریات سے اہل سنت کو اتفاق نہیں ہے اس نظریہ سے بھی اہل سنت کو اتفاق نہیں ہے۔ امام مالکؒ نے روضہ اطہر کی طرف اشارہ کر کے ایک بار فرمایا تھا کہ اس صاحب قبر کی بات کے سوا ہر شخص کی بات قبول بھی کی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے

كُلٌّ يُوخذ منه ويُردّ عليه الا صاحب هذا القبر

بلاشبہ علامہ ابن تیمیہ کے محاسن و کمالات بہت ہیں۔ ان کا بے مثال حافظہ ان کا غیر معمولی تبحر علمی، ان کی خداداد جرأت و شجاعت دین کے معاملہ میں ان کی غیرت و حمیت، ان کا تقویٰ اور خشیت یہ سب کچھ مسلّم ہے۔ ان کی زبان ابر گوہر بار تھی ان کا قلم تیغ اصیل تھا ان کی حاضر جوابی بے نظیر تھی۔ ان تمام صفات و کمالات کے باوجود جہاں تک میانہ روی اور مسلک کے توازن اور زبان و قلم کی احتیاط کا تعلق ہے اس بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے اور بہت سے مستند علماء نے بہت کچھ کہا بھی ہے۔ یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں بہت سے مسائل میں ان کے یہاں شذوذ بھی پایا جاتا ہے روضۂ اقدس کی زیارت اور تطلیقات ثلاثہ وغیرہ

---

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۲۱۲ - ۲۱۴

کے بارے میں ان کے تفردات کا علم سب کو ہے ۔ یہاں بھی ردِّ شیعت کے جوش میں اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا ہے ۔ علم عقاید اور کلام کی کتابوں میں تو حضرت حسینؓ کو برسرِ حق اور یزید کو برسر باطل لکھا گیا ہے ۔ شرح عقائد نسفی اور متعدد علم کلام کی کتابوں میں یہی مذکور ہے ۔ شرح عقائد نسفی میں امام شافعی کا یہ قول بھی مذکور ہے کہ امام بوجہِ فسق معزول ہو جائے گا ۔ اسی طرح ہر امیر اور ہر قاضی کا یہی حکم ہے کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک فاسق قابلِ ولایت نہیں کیونکہ وہ اپنی جان کو گناہ سے محفوظ نہیں رکھ سکتا تو رعیت کو کس طرح بچائے گا[۱]۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک امام فاسق بھی قابلِ ولایت ہے ۔ اصل یہ ہے کہ یہ مسئلہ علماء کے نزدیک مختلف فیہ رہا ہے ۔ اور یہ اختلاف ظاہر ہے کہ امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دور کے بہت بعد رونما ہوا ۔ جن بزرگوں نے امام کے خلاف اقدام سے روکا ان کی مصلحت یہ تھی کہ مسلمانوں کو خوں ریزی سے بچایا جائے اور خلافت خاصہ نہ سہی خلافتِ عامہ باقی رہے ۔ دشمنانِ اسلام کو اسلامی حکومت کی طرف معاندانہ نظر اٹھانے کا موقع نہ ملے ۔ جن بزرگوں نے اقدام کی اجازت دی ہے ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسلمان ظالموں کے ظلم و جور سے محفوظ رہیں اور عادلانہ نظامِ خلافت جو شریعت کے اصولوں پر مبنی ہو قائم ہو سکے اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے طرزِ عمل کو بھی مدِّ نظر رکھنا چاہیے ۔ ہم یہاں بعض دوسرے علماء اور محققین کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں ۔

ظالم حکمراں کے خلاف اقدام کے بارے میں علامہ ابنِ حزم کا موقف

علامہ حافظ ابنِ حزم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاہانِ حکومت اگر خیانت اور غلط کاری کے مرتکب ہوں تو ان کے خلاف بغاوت واجب ہے کیونکہ یہ لوگ اللہ اور رسول سے جنگ کرنے والے ہیں ۔ زمین میں فساد برپا کرنے کے لئے کوشاں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے جان و مال کا نقصان کرتے ہیں اور معصوم لوگوں کے قتل سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔ یہ اپنے

---

[۱] اردو ترجمہ شرح عقائد نسفی ص ۲۳۶

عیش و آرام کے لئے اور بیت المال کو دولت سے بھر دینے کے لئے مسلمانوں تک پر جزیہ عاید کرتے ہیں اور مسلمانوں سے جزیہ وصول کرنے کے اس ظلم پر یہودیوں کو مقرر کرتے ہیں۔[1]

اس سلسلے میں علامہ ابن حزم نے مزید یہ لکھا ہے کہ جب حکمران کو شریعت کے دائرے میں واپس لانا اور ظلم و جور سے باز رکھنے کی تمام تدبیریں ناکام ہو جائیں تو اس طریقۂ کار کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں رہتا جسے "العنف الدموی" (خون ریزی) کہتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ خلیفۂ وقت کی اطاعت اور فرمانبرداری کا معاہدہ تو بربنائے کتاب وسنت ہے۔ اگر وہ کتاب وسنت کے مطابق چلیں تو ان کی اطاعت واجب ہے مگر وہ کتاب وسنت دو میں سے کسی ایک سے بھی انحراف کریں تو ان پر حد نافذ کی جائے۔ حد اور حق قائم کیا جائے اور انھیں سزا دی جائے لیکن اگر معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہو کہ معصوم انسانی جانوں کا اتلاف اور کتاب وسنت کے مطابق عمل اور امن و امان ان کو معزول کئے بغیر ممکن نہ ہو تو انھیں منصب خلافت سے برطرف کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور کسی دوسرے عادل اور خدا سے ڈرنے والے شخص کو خلیفہ بنایا جائے گا۔ اگر اس سلسلے میں خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھانے پر مجبور ہونا پڑے تو تلوار بھی اٹھائی جائے گی اور کتاب وسنت پر مبنی نظام کو بروئے کار لانے کے لئے ظالم حکمران کو قتل کردینا واجب ہو جائے گا۔[2]

بعض علماء نے یہ ضرور لکھا ہے کہ ظلم و جور کے خلاف تلوار اٹھانے کے بجائے صبر کا طریقہ اختیار کیا جائے گا اور ہاتھ کے بجائے محض زبان سے حالات کو بدلنے کی کوشش کی جائے گی اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو صرف دل سے برا سمجھا جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ علماء بعض احادیث کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ علامہ ابن حزم اس نقطۂ نظر کی پُر زور تردید کرتے ہیں اور یہ جواب دیتے ہیں کہ بعض مواقع پر اذیت رسانی اور حکمراں کی طرف سے زدوکوب کرنے کے مواقع پر صبر کی تلقین دلانے والی جو حدیثیں ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ اس صورت حال

---

[1] رسالۃ التلخیص لوجوہ التخلیص صفحہ ۱۷۳۔ ۱۷۴

[2] الفصل صفحہ ۱۶۷۔ ۱۷۶ ج ۴

کے بارے میں ہے جب خلیفہ نے اپنا نظامِ حکومت کتاب و سنت کے مطابق ترتیب دیا ہو۔ کبھی کبھی اگر اس سے زیادتیاں بھی ہو جائیں تو ان پر صبر کرنا چاہئے۔ لیکن اگر خلیفہ حق کے بجائے باطل پر ہو اور اس کی ستم رانیاں حد سے تجاوز کر جائیں اور اصل دین اور بے گناہ انسان کا خون بہایا جاتا ہو تو اللہ کی اس بات سے پناہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطلب یہ لیا جائے کہ حق کا خون ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی خاموشی اور صبر کا رویہ اختیار کیا جائے[1]۔

علامہ ابن حزم اپنے موقف کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ایک حدیث میں ہے جس میں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناحق مال چھیننے والے کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے یہ جواب دیا "تم اسے اپنا مال ہرگز مت دو"۔ پوچھا گیا! "اگر وہ میری جان کے درپے ہو جائے تو میں کیا کروں؟" آپ نے فرمایا "تم بھی اس سے قتال کرو"۔ پوچھا گیا "اگر میں اس کو قتل کر ڈالوں تو کیا ہوگا؟" آپ نے جواب عنایت فرمایا "وہ مقتول جہنمی ہوگا"۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا "اگر میں قتل کیا جاؤں تو" آپؐ نے فرمایا "تم جنت پا جاؤ گے"۔ یہ حدیث عام ہے۔ سلطان اور غیر سلطان دونوں پر اس کا اطلاق ہوگا[2]۔

علامہ ابنِ حزم کہتے ہیں کہ ممکن ہے کسی گوشے سے یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھانے سے مسلمانوں کی خوں ریزی ہو گی، اہلِ اسلام کا جان و مال ضائع ہوگا اور ممکن ہے حکومت کی فوج سے برسرِپیکار ہونا پڑے اور شکست ہو اور نتیجہ کچھ نہ نکلے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ظالم حکمراں کے خلاف تلوار اٹھانے کے لیے کچھ تو تیاری کرنی ہو گی لیکن جان و مال کے ضائع ہونے کا خطرہ اور اس شکست کا امکان ضرور موجود ہے لیکن شکست کا امکان تو اس جنگ میں بھی ہوتا ہے جو کافروں کے خلاف کی جاتی ہے اور بسا اوقات کافروں کی فوج کی تعداد کئی گنی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ان خطرات کا اعتبار کر لیا جائے تو کافروں کے خلاف جہاد بھی ساقط ہو جائے گا۔ حالانکہ دنیا میں کوئی مسلمان اس کا قائل

---

[1] الفصل صفحہ ۱۷۲، ۱۷۳ ج ۴

[2] الفصل صفحہ ۱۷۳ ج ۴

نہیں۔ اہلِ کفر کے خلاف جہاد کرنے سے اس کا بھی خطرہ ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں مرد اور بچے غلام اور قیدی بنائے جائیں اور ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس پر کسی کا اختلاف نہیں کہ اہلِ کفر سے جہاد واجب ہے۔ لہٰذا ان دونوں معاملات میں یعنی کفار کے خلاف جہاد اور بے راہ رو مسلم خلفاء کے خلاف جہاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا درجہ جہاد کا ہے اور دونوں کا مقصود کتاب وسنت کی عملداری ہے۔[1]

علامہ ابنِ حزم کا خیال ہے کہ اگر مسلمان حکمراں کا معاملہ یہ ہو گیا ہو اس کو کفر اور اہلِ کفر کے ساتھ موالات عزیز ہو اور اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی اس کا شیوہ ہو ایسی صورت میں صبر کی تلقین کرنا روحِ اسلام کی مخالفت ہے۔ ایسے حکمراں کو ان کے نزدیک ہٹانا اور اس سے قتال کرنا فرض ہے۔ البتہ تصادم اور مقابلے کی کوئی شکل نہ رہ جائے اور اہلِ حق بہت ہی کمزور ہوں اور جنگ ناممکن ہو تو پھر صورتحال کے لحاظ سے جو کچھ اور جتنا کچھ ممکن ہو کیا جائے۔[2]

فاسق وفاجر حکمراں کے خلاف کارروائی کے بارے میں امام غزالی کا موقف

جہاں تک پوشیدہ طریقے سے نصیحت اور زبانی تنقید واحتساب کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ یہ بالکل درست کام ہے اور کسی کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اگر فہمائش ونصیحت کی تمام کوششیں رائیگاں چلی جائیں یا حاکم دین سے دور اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں علانیہ طور پر لاپرواہ ہو اور سمجھانے بجھانے کی کوئی کوشش اس پر کارگر نہ ہو سکتی ہو تو اس صورت میں ایسے حکمراں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جا سکتی ہے یا نہیں اس بارے میں امام غزالی یہ لکھتے ہیں۔

> "رعایا کی طرف سے حاکم کے خلاف تادیبی کارروائی کا معاملہ مشکل معاملہ ہے۔ بیٹے کی طرف سے والدین کی اصلاح کی کوشش نسبتاً

---

[1] الفصل صفحہ ۱۷۳، ج ۴

[2] الفصل صفحہ ۱۷۵، جلد ۴

آسان ہے۔ حاکم کی اصلاح، نصیحت اور خیر خواہی کے کلمات سے چل سکتا ہو
تو ٹھیک ہے بحث اس میں ہو سکتا ہے کہ شاہی بیت المال میں غصب کا
ناجائز مال موجود ہو تو چڑھائی کر کے زبردستی مال لینا اور مالکوں کے حوالے
کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ اگر وہ لباسِ حریر زیب تن کرتا ہو تو اس کا دامن و
گریبان پکڑا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اگر شراب کی صراحیاں اس کی مجلس میں ہوں
تو انھیں زبردستی توڑا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں ایک پہلو تو یہ ہے
کہ اس طرح کا اقدام حاکم کے رعب داب اور ہیبت و حشمت کو کم کرتا ہے۔
جس کی ممانعت شرع میں ہے اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ سب کچھ
امرِ منکر ہے اور منکر پر سکوت حرام ہے۔ اب یہاں پر دو ممنوع امر ایک
دوسرے کے معارض ہوئے تو اس کا حل یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے گا کہ حاکم کا
منکر کس درجے کا ہے اور اگر حاکم کے خلاف اقدام کرنے سے اس کی
ہیبت ختم ہو جائے گی اور منکر بڑے درجے کا نہیں ہے تو یہاں اس امر کا
خیال رکھا جائے گا کہ حاکم کے رعب اور ہیبت کو نہیں ختم کرنا چاہئے لیکن
اگر معاملہ دوسرا ہو اور منکر بڑا ہو تو یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس بارے میں
تفصیل کو ضبطِ بیان میں لانا مشکل ہے یعنی اس کا تعلق حالات کی نوعیت
سے ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے کو اس میں اجتہاد سے کام
لینا ہو گا۔[1]

امام غزالی کے مذکورہ بالا بیان سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اگر اقتدار کی باگ ڈور بالکل
ہی غیر شرعی طریقے سے کسی شخص کے ہاتھ میں آ گئی ہو اور وہ خود بھی فاسق اور بدکردار ہو اور اس
کا ظلم و جور سے حد سے بڑھ گیا ہو اور اس کی اصلاح کی کوئی تدبیر باقی نہ رہ گئی ہو تو ظاہر ہے
کہ ایسے حکمراں کے رعب اور ہیبت اور احتشام کے باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا ہے

---

[1] احیاء علوم الدین جلد دوم، باب امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

ان کے بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ طاقت کے ذریعہ ہی اس منکر کو مٹانا ضروری ہوگا۔

علامہ ابو بکر جصاص کا موقف

"گذشتہ تمام معتقدین و متاخرین اہل دین وفقہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ البتہ کچھ بے خبر اور دین سے بے بہرہ لوگوں کا ایک گروہ ہے جن کو اس سے اختلاف ہے وہ ہتھیار اٹھانے اور باغی گروہ سے لڑنے کو فتنہ وفساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر اللہ (تم باغی جماعت سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے) آیت کے الفاظ صاف تقاضہ کرتے ہیں کہ باغی گروہ سے جنگ کرنا واجب ہے۔ لیکن اس حکم صریح کے باوجود دین سے بے بہرہ حشو یہ کا گروہ کہتا ہے کہ حاکم وقت اگر ظلم وجور اور قتلِ نفس جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے جیسے منکرات کا بھی ارتکاب کرے تو اس پر نکیر نہیں کی جائے گی۔ ہاں اگر غیر حاکم سے ان کا ارتکاب ہو تو زبان یا ہاتھ سے نکیر کا حق ہے مگر اس صورت میں بھی ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گمراہ طبقہ دین کے دشمنوں سے بھی زیادہ برا ہے کیونکہ اس گروہ نے لوگوں کو باغی گروہ سے جنگ اور حاکم کے ظلم و جور پر نکیر کرنے سے روک دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہایت فاسق اور فاجر بلکہ دشمنِ اسلام تک اقتدار پر غالب آگئے ہیں سرحدیں خراب ہو رہی ہیں ظلم پھیل رہا ہے، شہر برباد ہو رہے ہیں۔ یہ سب نتیجہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑنے اور سلطانِ جائر پر نکیر نہ کرنے کا[1]

---

[1] احکام القرآن جلد دوم صفحہ ۳۴

ابوالمعالی امام الحرمین کا نقطۂ نظر

مسلم کی مشہور حدیث ہے

من رأی منکم منکراً فلیغیّرہ بیدہ فان لم یستطیع فبلسانہ فان لم یستطیع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان

تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ اسے ہاتھ سے (قوت وطاقت کے استعمال سے) مٹادے اور اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے منکر کو روکنے کی کوشش کرے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے دل سے برا سمجھے اور صرف اپنے دل سے برا سمجھنا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

امام نوویؒ اپنی شرح مسلم میں امام الحرمین کا قول نقل کرتے ہیں

واذا جار والی الوقت وظهر ظلمہ وغشمہ ولم ینزجر حین زُجر عن سوء صنیعہ بالقول فلاهل الحل والعقد التواطؤ على خلعہ ولو بشهر الاسلحۃ ونصب الحروب هذا کلام امام الحرمین

وقت کا حکمران اگر ظلم پر کمربستہ ہو اور ظلم وجور کا پہلو بہت نمایاں ہو اور زبان سے روکے جانے پر بھی وہ اپنے کرتوت سے باز نہ آئے تو یہ ارباب حل وعقد کی ذمہ داری ہے کہ اسے اقتدار سے بے دخل کرنے پر متحد ہوں خواہ اس کے لئے اپنی ہتھیار ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے اور جنگی اقدامات ہی کیوں نہ کرنے پڑیں۔ یہ امام الحرمین کے الفاظ ہیں[1]

واقعۂ کربلا کی دینی و شرعی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے علماء دین کے یہ بیانات کافی ہیں۔ یقیناً عزیمت کی راہ یہی ہے اور حضرت حسینؓ کا اقدام عزیمت علماء اور محققین کے درمیان متفق علیہ مسئلہ رہا ہے اور اس میں سے کسی کے شاذ نظریات سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ہم یہاں حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے بزرگوں کے اقدامات

---

[1] شرح مسلم للنووی جلد ۲ صفحہ ۵۲

کی شرعی صحت کو ثابت کرنے کے لئے مرویات حضرت عمرؓ میں سے ایک روایت کو پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جس کے بعد کسی کے قول کو پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ۔

حضرت عمرؓ کی حدیث

ایک حدیث ہے جس میں حضرت عمرؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان فرمایا ہے:

انہ تصیب فی امتی فی آخر الزمان من سلطانہم شدائد لاینجو منہ الی رجل عرف دین اللہ فجاھد علیہ بلسانہ و یدہ وقلبہ فذلک الذی سبقت لہ السوابق ورجل عرف دین اللہ فصدق بہ ورجل عرف دین اللہ فسکت علیہ فان رأی من یعمل الخیر احبہ علیہ وان رأی من یعمل بباطل ابغضہ علیہ فذلک الذی ینجو علی ابطانہ کلہ

یقیناً آخر زمانے میں میری امت کو ان کے بادشاہوں کی جانب سے سختیاں لاحق ہوں گی اس سے وہی شخص نجات پائے گا جس نے خدا کے دین کو پہچانا اور اس کے لئے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ اور اپنے قلب سے جہاد کیا۔ بس یہی شخص ہے جس کے لئے خدا کی رحمت اور دنیوی واخروی سعادت آگے بڑھے گی۔ اس کے بعد مرتبے کے لحاظ سے وہ شخص ہے جس نے خدا کے دین کو پہچانا (زبان و دل سے) دین کی تصدیق کی پھر اس کے بعد مرتبے کے اعتبار سے وہ شخص ہے جس نے دین کے قدروں کو پہچانا اور خاموشی سے اختیار کی اور جو شخص کسی کو نیک کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی نیکی کی وجہ سے اس سے محبت کرتا ہے اور کسی کو باطل کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس شخص سے نفرت کرتا ہے تو ایسا شخص بھی نجات پانے والوں میں سے ہوگا کیونکہ اس نے حق کی محبت اور باطل سے نفرت کو اپنے دل میں چھپائے رکھا[1]

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الادب فی الامر بالمعروف ونہی عن المنکر

اس مقام پر اس مشہور حدیث کا نقل کر دینا بھی مناسب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا لا یمنعنّ رجلا مھابۃ الناس ان یتکلم بالحق اذا علمہ الاانّ افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر	کسی شخص کو لوگوں کا خوف اور دبدبہ حق بات کہنے سے ہرگز نہ روکے جبکہ وہ اس کو جانتا ہو ہاں سن لو کہ سب سے ثواب والا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے [۱]

ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت کو سب سے بڑا جہاد کیوں قرار دیا گیا ہے اس سلسلے میں علّامہ خطابیؒ کہتے ہیں۔

"یہ سب سے زیادہ فضیلت والا جہاد اس لئے ہے کہ جو شخص دشمنِ اسلام سے جہاد کرتا ہے وہ امید اور خوف کے درمیان متردد ہوتا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ فاتح ہوگا یا مفتوح (یعنی اس کے شہادت پانے کا بھی امکان ہے اور کامیاب ہونے کا بھی امکان ہے) البتہ جو شخص ظالم بادشاہ پر تنقید کرتا ہے تو اس کے ہاتھ میں مجبور ہے جب وہ اس کے سامنے حق کا اظہار کرے گا اور معروف کا حکم دے گا تو اس طرح سے وہ اپنی ہلاکت اور بربادی کے درپے ہوگا۔ خوف کے پہلو کے غالب ہونے کی وجہ سے یہ جہاد کی سب سے برتر قسم قرار پائی [۲]۔

اعتدال کی راہ

بلاشبہ صحیح احادیث میں امراء و حکام کی اطاعت کا حکم موجود ہے۔ اور عام حالات میں ان احادیث کی روشنی میں ان سے بغاوت یا ان کے خلاف خروج درست نہیں۔ لیکن جب صورتِ حال یہ ہو کہ اسلام کے صحیح نظام کا حلیہ بگڑ رہا ہو یا دین کی بنیادیں متاثر ہو رہی ہوں

---

[۱] مسند احمد و ترمذی کتاب الفتن

[۲] معالم السنن جلد ۴ صفحہ ۳۵۰

اور وقت کا فرماں روا جس کی حکومت کی اصل ذمہ داری اقامت صلوٰۃ ہو نماز کے بارے میں لاپرواہی کا شکار ہو اور ہوس و ہوا کا اسیر ہو کر رہ گیا ہو تو پھر یہ اہلِ عزیمت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ خاموش نہ رہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ امیر و حاکم کی اطاعت بھی ضروری ہے لیکن اس کا وجود اگر فتنہ بن جائے تو اصلاح و درستی کی کوشش بھی ضروری ہے امام نووی نے جو صحیح مسلم کے شارح ہیں کتاب الامارہ باب وجوب اطاعت الامراء میں دونوں اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک قول ہر حالت میں اطاعت و انقیاد کا ہے اور دوسرا قول یہ ہے

وقد ردّ علیہ بعضھم ھذا بقیام الحسین وابن زبیر (ای خروجھما علی یزید) واھلِ المدینۃ علی بنی امیہ وبقیام جماعۃٍ عظیمۃٍ من التابعین والصدر الاول علی الحجاج مع الاشعث۔

بعض حضرات نے اس قول کا رد کیا ہے اور اور یزید کے خلاف حسین بن علی اور ابنِ زبیر کے اقدام سے اور اہلِ مدینہ کے بنی امیہ کے خلاف بغاوت سے اور تابعین کی اور صدرِ اول کی ایک بہت بڑی جماعت کی حجاج کے خلاف بغاوت سے اور اشعث کی طرفداری سے حجت اور دلیل پیش کی[1]

یعنی حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تابعین عظام اور اہلِ مدینہ کے صلحاء کا بنی امیہ کے خلاف اقدام ایک نظیر ہے کہ جب ایوانِ حکومت میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہو اور سربراہِ مملکت کی رند مشربی اور عیش کوشی کے اثرات معاشرے پر پڑ رہے ہوں اور شورائی نظام کی جگہ استبدادی نظام جگہ لے رہا ہو تو وہ سرفروشانہ اقدام بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس کی نظیر امام حسین نے پیش کی۔

صدرِ اول کی تاریخ میں ایک نظیر حضرت حسنؓ کی ہے اور دوسری حضرت حسینؓ کی۔ بالفاظِ دیگر تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ جب حضرت معاویہؓ جیسی شخصیت میدان میں ہو تو حضرت حسن

---

[1] شرح صحیح مسلم ج دوم صفحہ ۱۲۵

کے اسوہ کو اختیار کرنا چاہئے لیکن اگر مقابلہ یزید سے ہو تو عزیمت کی بات وہی ہے جو حضرت حسینؓ کا موقف ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کے اقتباسات سے ان کا جو موقف بظاہر معلوم ہوتا ہے وہ نہ تو اعتدال کی راہ ہے اور نہ یہ جمہور امت کا مسلک ہے ناصبیوں کے گروہ نے اہلِ بیت کی دشمنی میں یہ موقف ضرور اختیار کیا ہے اس سلسلہ میں ایک مثال قاضی ابن عربی کی ہے جن کے بارے میں تحفہ اثنا عشریہ کے مصنف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تصریح کی ہے کہ وہ ناصبی ہیں ورنہ علماء اور محدثین اور فقہاء حضرت حسینؓ کے اقدام کو درست ہونے پر اور یزید کی خلافت سے اختلاف پر گویا متفق ہیں۔ یہاں شارح بخاری حافظ ابنِ حجرؒ کا قول نقل کیا جاتا ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی کا موقف حسینؓ و یزید کے بارے میں

حافظ ابنِ حجر عسقلانی فتح الباری میں ابنِ تیمیہ کے موقف کے بالکل برخلاف حضرت حسینؓ کے اقدامِ خروج کو دینی بصیرت کے اعتبار سے درست اور اعلاء کلمۃ اللہ سے اسے وابستہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "ایک قسم ان حضرات کی ہے جو حکام کے ظلم و ستم اور سنتِ نبوی پر ان کے عمل نہ کرنے کی بناء پر دینی غیرت و حمیت میں نکلے۔ یہ سب اہلِ حق ہیں۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اور اہلِ مدینہ جنھوں نے مقامِ حرہ میں جہاد کیا اور وہ تمام اہلِ علم و دین جو حجاج سے برسرِ پیکار ہوئے جن کا شمار اہلِ حق میں ہیں اور حق ان ہی کے ساتھ تھا۔"[1]

خروج کے بارے میں اور تلوار اٹھانے کے سلسلہ میں شرعی نقطہ نظر کیا ہے اس کی توضیح کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں۔

> "جو کسی ایسے حکمراں کی اطاعت سے نکلے جو ظالم ہو اور اس شخص کی جان یا مال

---

[1] فتح الباری ج ۱۲ ص ۲۴۰

یا اہل وعیال پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہو ایسا شخص معذور ہے اور اس شخص سے قتال حلال نہیں اور اس شخص کو اپنی طاقت کے مطابق اپنی جان و مال اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے دفاع کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ طبری نے بسند صحیح عبداللہ بن حارث سے روایت کیا ہے اور وہ بنی مضر کے ایک شخص کے ذریعہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ان لوگوں کا ذکر فرماتے ہوئے جو خلیفہ کے خلاف خروج کرتے ہیں فرمایا کہ اگر یہ لوگ امام عادل کے خلاف خروج کریں تو ان سے قتال کرو اور اگر ظالم حکمراں کی مخالفت کریں تو ان سے قتل وقتال نہ کرو کیونکہ ان کو کہنے کا حق حاصل ہے۔"

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

"اور اسی صورت پر محمول ہوگا جو حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ پیش آیا اور پھر مقام حرہ میں اہلِ مدینہ کے ساتھ اور پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اور ان علماء کے ساتھ جنھوں نے عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث کے واقعہ میں حجاج کے خلاف خروج کیا تھا کہ ان سب حضرات سے قتال ناجائز تھا۔"[1]

انعقادِ امامت کا مسئلہ اور یزید اور اسلام کا اصولِ حکمرانی

بعض علماء کے نزدیک یزید کی خلافت بھی مکمل طور پر منعقد نہیں ہوئی کیونکہ تمام اربابِ حل وعقد کی بہ رضا ورغبت بیعت پائی نہیں گئی۔ امام احمد بن حنبل کے نزدیک ارباب حل و عقد کا اجماع شرط ہے۔

الامام الذی یجتمع قول اهل الحل والعقد علیه کلهم

امام وہ ہے جس پر تمام حل وعقد کے قول کا اتفاق ہو۔[2]

---

[1] فتح الباری ج ۱۲ ص ۲۵۳ - ۲۵۴

[2] الاحکام السلطانیة للقاضی ابی یعلی الحنبلی صفحہ ۷

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک انعقادِ خلافت کے لئے اہلِ ایمان کا اور خاص طور پر اہلِ صلاح وتقویٰ کا اتفاق ضروری ہے یہ بات تو دانھوں نے خلیفۂ عباسی منصور کے سامنے کہی تھی:

ما اجتمع علیك اثنان من اهل التقوی والخلافة تکون باجتماع المؤمنین ومشورتهم [1]	تمھاری خلافت میں دو اہلِ تقویٰ کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ خلافت مومنین کے اجتماع اور مشورے سے منعقد ہوتی ہے۔

امامت کی شرطوں میں بعض علماء نے عدالت اور دین میں افضلیت کی شرط بھی لگائی ہے زیادہ تر علماء کے نزدیک یہ شرط ساقط بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ عامۃ المسلمین امام سے راضی اور اس کی خلافت پر دل سے مطمئن ہوں۔

وهو ان تکون النفوس قد سکنت الیه وکلمتهم علیه اجمع [2]	نفوس اس کی طرف سے راضی اور مطمئن ہوں اور اس کے بارے میں اجماع کلمہ ہو چکا ہو۔

اگر خلیفہ اپنی زندگی میں مسلمانوں میں سے کسی ممتاز شخص کو اپنا جانشین بنائے تو جانشین کے اندر بھی شرائط امامت کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور ان شرائط میں استمرار اور دوام ہونا چاہئے۔

ویُعتبر فی المعهود الیه شروط الامامة وقت العهد الیه و استدامتها الی مابعد الموت [3]	جس شخص کو جانشین اور ولی عہد بنایا جائے اس کے لئے بوقتِ ولیعہدی شرائطِ امامت پر پورا اترنا چاہئے اور جانشین بنانے والے کی وفات کے بعد بھی ان شرائط کو پایا جانا چاہئے۔

ان شرائط کو اگر مدِ نظر رکھا جائے تو یزید لائقِ امامت ہی نہ تھا چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں:

---

[1] ابوحنیفہ للشیخ ابی زهرہ صفحہ ۱۶۵

[2] الاحکام السلطانیۃ ۴

[3] الاحکام السلطانیۃ صفحہ ۹

"باجماع مؤرخین ثابت ہے کہ جب حضرت امام حسینؓ نے یزید کو
باطل پر جانا اور لائقِ امامت کے نہ دیکھا...... تو یزید کی بیعت قبول نہ
فرمائی یہاں تک کہ یزید کے لشکر سے لڑے اور اپنے اصحاب سمیت درجۂ
شہادت کو پہنچے۔"[1]

تنہا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نہیں بلکہ ان کے بعد بھی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر حضرت مولانا قاسم نانا توئیؒ تک تمام بزرگوں کا یہی عقیدہ رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ازالۃ الخفا فصل پنجم میں شہادت امام حسینؓ اور واقعۂ حرہ سے متعلق کتاب الفتن کی متعدد احادیث نقل کی ہیں جن میں ایک حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی ہے جس میں انھوں نے یہ کہا ہے:

اعوذ باللّٰہ من رأس الستین وامارۃ الصبیان۔	میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ۶۰ھ کے شروع ہونے اور لونڈوں کی حکومت سے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یشیر الی خلافۃ یزید بن معاویہ لانہا کانت سنۃ ستین من الھجرۃ	اس کا اشارہ یزید بن معاویہ کی خلافت کی طرف ہے کیونکہ اس کی حکومت ۶۰ھ میں قائم ہوئی تھی۔[2]

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بھی سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں جو معجزات پر مشتمل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے باب میں اس طرح کی ایک حدیث بیان کی ہے جس میں اشارہ یزید کے فتنہ کی طرف ہے۔ کتاب الفتن کی ان احادیث کی وجہ سے علماء اور محققینِ دین کو اس نتیجے تک پہنچنے میں آسانی ہوئی کہ حق امام حسینؓ کے ساتھ تھا۔ اور یہ کہنا کہ یزید کوئی ایسا باطل نہ تھا کہ جس کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی جا سکتی نہایت نادرست قول ہے۔ اس

---

[1] تحفۂ اثنا عشریہ در خواص مذاہب شیعہ۔

[2] فتح الباری ج ۱ ص ۱۹۳

موضوع پر مولانا قاسم نانوتوئیؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

"جس وقت حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنا ولی عہد بنایا اس کا فسق ظاہر نہ تھا اگر کچھ کیا ہوگا تو در پردہ جس کی خبر امیر معاویہؓ کو نہ تھی۔"

"امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید نے ہاتھ پیر پھیلائے اور دل و جان سے برائی میں لگ گیا۔ برائی کا اعلان شروع کر دیا۔ نماز چھوڑ دی بس بعض مقدمات گزشتہ کی بنا پر معزول کرنے کے لائق ہوگیا۔"

"شاید اس وقت اربابِ حق و عقد کی رائیں اور تدبیریں الگ ہوگئیں کسی پر فتنہ و فساد کا اندیشہ غالب آگیا۔ اور بدرجۂ مجبوری بادلِ ناخواستہ بیعت قبول کرلی ..... اور جس کو ایک جماعتِ کثیر کے وعدوں پر معزول کر دینے میں کامیابی کی امید دکھائی دی اس نے خدا کے بھروسے پر لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ اختلاف محض امیدوں اور اندیشوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے اہلِ کوفہ کی غداری کی وجہ سے حضرت امام حسینؓ کی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اور عاشورہ کے دن میدانِ کربلا کے اندر قیامت سے پہلے قیامت قائم ہوگئی۔"

"موجودہ صورت میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت میں کیا شبہ ہے یزید تو آپ کا خلیفہ تھا اور نہ یزید پر خروج کرنا ناجائز تھا۔ اور اگر خلیفہ تھا بھی تو بھی اس پر خروج ممنوع نہ تھا۔"[1]

خلافتِ راشدہ کا عہد اسلامی خلافت کے لئے اسوہ اور معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر کسی کا اختلاف نہیں۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے یہ ایک زرّیں عہد ہے۔ کامیابی مقدر ہو یا نہ ہو اس کی بازآفرینی اور بازیابی کی آرزو سے کسی مسلمان کا دل کبھی خالی نہیں رہا ہے۔ بہت سے اہلِ عزیمت نے اس اعلیٰ اور مثالی نمونے کے قریب ہونے کی کوشش اپنے اپنے زمانہ میں کی ہے۔ انسان صرف اس سعی و کوشش کا مکلف ہے کہ جہاں تک ہوسکے خلافتِ راشدہ سے مشابہت رکھنے والا اجتماعی نظام قائم ہوجائے

---

[1] قاسم العلوم ص۲۱۳۔ بحوالہ مکاتیب شیخ الاسلام از مولانا حسین احمد مدنیؒ۔

اسلام کی تاریخ میں ان کوششوں کے نتیجہ میں وہ وقفے ملتے ہیں جن سے خلافتِ راشدہ کے بابرکت زمانہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کی ہدایت اور تذکیر کی کوششیں حکمرانوں کی غلط کاریوں پر انھیں ٹوکنا اور تمام اندیشوں کے باوجود کلمۂ حق زبان پر لانا اسی خیر آرزو کی موجودگی کی علامت ہے جو ایک مومن کو بے چین رکھتی ہے۔ یہ بات تاریخی طور پر مسلّم ہے کہ یزید کی ولیعہدی کے ذریعہ خلافت راشدہ کے اجتماعی نظام سے انحراف پایا گیا تھا۔ اس ولیعہدی کی تحریک جس نے بھی پیش کی ہو اسے اجتہادی غلطی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ نہ صرف اس لئے کہ زبانِ نبوی نے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ وہی اصولِ حکمرانی قرآنی آیتوں کے ذریعہ بھی صحیح قرار پاتے ہیں جو عہد خلافت راشدہ میں پائے جاتے تھے۔

ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانٰت الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ط ان اللہ نعما یعظکم بہ ط ان اللہ کان سمیعًا بصیرا ٥ یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاٰخر ط ذالک خیر واحسن تأویلا ٥

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم (ہر قسم کی) امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل اور حقدار ہیں اور (اے حاکمو) جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو عدل و انصاف سے کرو۔ بے شک اللہ تمھیں کیا خوب نصیحت فرماتا ہے اللہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اولوالامر کی اطاعت کرو پس اگر تمھارے درمیان (تمھارے اور اولوالامر کے درمیان) کسی بات پر نزاع ہوجائے تو اللہ اور رسول کی طرف حتمی فیصلہ کے لئے لوٹا دو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام سب سے اچھا ہے [1]

---

[1] النساء ۵۸ - ۵۹

تخت اقتدار منصب اور حکومت ذاتی جائداد اور ملکیت کسی کی نہیں یہ ایک امانت اور ٹرسٹ ہے۔ اس آیت کی روشنی میں ان امانتوں کو صرف ان کے سپرد کرنا چاہیے جو امانتوں کے اہل اور حق دار ہیں۔ غیر مستحق اور نااہل افراد کو یہ امانت سپرد نہیں کرنی چاہئے۔ لفظ امانت اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے اور اس آیت سے اسلام کے سیاسی نظام کے بہت سے اصول مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔

(۱)۔ اسلام میں حکومت شخصی اور موروثی نہیں ہے بلکہ ایک امانت ہے۔

(۲)۔ حکومت کے مالک حکام نہیں بلکہ غیر حکام ہیں جو کسی شخص کو سپرد کرکے اسے حاکم بناتے ہیں۔ اس لئے اقتدار و حکومت کا تحقق غیر حکام کی سپردگی کے ذریعہ ہوگا بالفاظِ دیگر اس حکومت کو نمائندہ اور منتخبہ ہونا چاہئے۔

(۳)۔ منصب حکومت پر صرف حقدار اور اہل (الی اھلہا) شخص کو بٹھانا چاہئے۔

(۴)۔ حکام کے لئے عدل و انصاف کا حکم ہے یعنی ظلم و جور کی وجہ سے یا اہلیت کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے یہ معاہدہ قابلِ تنسیخ ہوسکتا ہے۔

(۵)۔ حاکم اور محکوم یکساں طور پر خدا اور رسول کے قانون کے تابع ہیں۔

(۶)۔ محکوم کو حاکم سے نزاع و اختلاف کی اجازت ہے بشرطیکہ اس کی بنیاد قرآن و سنت ہو۔

(۷)۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس نزاع کا فیصلہ ہوگا۔ قرآن و سنت کو حتمی اور قطعی حیثیت حاصل ہے۔

(۸)۔ قرآن و سنت پر مبنی فیصلہ کرنے والی عدالت کو حاکم کے اثر سے آزاد ہونا چاہیے۔

(۹)۔ صلاح و فلاح صرف اس نظام میں ہے جس کے اصول اوپر بتائے گئے۔

علماء اور محققین نے خلیفۂ اسلام کے لئے متعدد شرطیں بیان کی ہیں مسلمان ہونا آزاد ہونا عاقل و بالغ ہونا عادل اور عالم ہونا قریشی ہونا جنگی اور انتظامی امور میں باصلاحیت ہونا اور فاسق و فاجر نہ ہونا یہ سب شرطیں ہیں۔ بعض شرطوں میں اختلاف ہے اور بعض میں اختلاف نہیں ہے اس پر کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ فاسق کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی جائے گی۔

اختلاف اس میں ہے کہ فسق بعد میں پیدا ہوا یا فسق کی خبر نہ تھی تو بیعت ختم کی جاسکتی ہے یا نہیں ایک قول یہ ہے کہ صرف کفر کے ظاہر ہونے اور اقامت ۔ صلوٰۃ کے نہ کرنے پر یا شریعت کے کسی حکم کے نہ ماننے پر بیعت ختم کی جاسکتی ہے ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر کفر نہ بھی ہو لیکن فسق ظاہر اور معلوم ہو تو بیعت ختم کی جاسکتی ہے

اب اس زمانہ میں جو نبوت سے قریب تھا اور ان لوگوں کی موجودگی میں جنھوں نے نبوت کا اور خلافتِ راشدہ کا زمانہ پایا تھا قرآن کے عطا کردہ اصولوں سے خلفاء راشدین کے بابرکت طریقوں سے اگر کوئی انحراف پایا جائے اور ان نفوس قدسیہ کی آنکھوں کے سامنے ایسے شخص کو مسندِ حکم رانی پر بٹھا دیا جائے جس کا دامن داغ داغ ہے اور پھر کوئی اضطراب نہ ہو اور مقاومت کے لئے کوئی کھڑا نہ ہو اور کوئی اس نظام کو چیلنج نہ کرے یہ بات عقلِ عام کے بھی خلاف ہے اور دینی ضمیر کے بھی خلاف ہے ۔

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

وہ فاسقانہ ثقافت جو یزید کے دور اور اس کے دربار میں پروان چڑھ رہی تھی تاریخ کی بے شمار کتابیں اس کی گواہ ہیں ۔ یزید کے فسق و فجور کی بے شمار روایتوں کا انکار بعض اہلِ قلم نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ جن معتبر شخصیتوں نے یزید کے ہاتھ میں بیعت سے انکار کیا تھا ان کی زبان سے یزید کے فسق و فجور کی کوئی بات رکارڈ میں نہیں ہے اور ان کی زبان سے ہمیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جس سے اس کی بدکرداری کی شہرتِ عام کی تصدیق ہوتی ہو ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ زمانہ تو خیر القرون سے بہت قریب تھا ۔ آج کے گئے گزرے دور میں بھی اہلِ دل علماء اور اصفیاء کی مجلسیں لوگوں کی بدکرداری کے ذکر سے خالی ہوتی ہیں اور فسق و فجور کا تذکرہ ان کی ثقاہت کے منافی ہوتا ہے ۔ ان باتوں کا تذکرہ ان کی زبان پر بدرجہ مجبوری اور بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت آتا ہے اور صراحتاً کم اشارتاً زیادہ ۔ امام حسینؓ نے شہادت سے پہلے جو خطبہ دیا ہے جس میں انھوں نے اپنے اقدام کی شرعی اہمیت بیان کی اس میں بھی یزید اور اس کے حلقہ بگوشوں کے کردار کی طرف اشارہ موجود ہے ۔

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے ظالم، محرمات الٰہی کو حلال کرنے والے خدا کے عہد کو توڑنے والے خدا اور رسول کے مخالف اور خدا کے بندوں پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ حکومت کرتے والے بادشاہ کو دیکھا اور قولاً و عملاً اس پر غیرت نہ آئی تو خدا کو حق ہے اس شخص کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کر دے۔ لوگو! خبردار ہو جاؤ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی اور رحمان کی اطاعت چھوڑ دی ملک میں فساد پھیلایا ہے، حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے، مالِ غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے ہیں خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام کر دیا ہے اس لئے مجھ کو غیرت میں آنے کا زیادہ حق ہے"[1]

حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر نے اہلِ مکہ کے سامنے تقریر کی اس تقریر میں انھوں نے حضرت حسینؓ کے مقامِ عظمت کو موثر انداز میں بیان کیا ہے اور یزید کے دامن کو معصیت سے آلودہ قرار دیا ہے۔

اما واللہ لقد قتلوہ طویلاً باللیل قیامہ کثیراً فی النھار صیامہ احق بماھم فیہ منھم واولٰی بہ فی الدین والفضل اما واللہ ماکان یبدل بالقراٰن الغناء ولا بالبکاء من خشیۃ اللہ الحداء ولا بالصیام شرب الحرام ولا بالمجالس فی حلق الذکر الرکض فی تطلاب الصید (یعرض بیزید) فسوف یلقون غیاً۔[2]

خدا کی قسم انھوں نے اس حسین کو قتل کیا جو رات کو دیر تک نمازوں میں کھڑے رہتے اور دن میں کثرت سے روزے رکھتے تھے اور جو اقتدار ان کو ملا ہے وہ اس کے ان سے زیادہ حقدار اور دین و فضل کے اعتبار سے زیادہ مستحق تھے بخدا وہ تلاوت قرآن کے بجائے گانے بجانے اور خوفِ الٰہی سے رونے کے بجائے نغمہ و سرود کا شغل نہیں رکھتے تھے نہ روزوں کے بجائے شراب نوشی میں مصروف رہتے تھے۔ نہ ذکرِ الٰہی کی مجالس کو چھوڑ کر شکار کی جستجو میں گھوڑے کو ایڑ لگایا

---

[1] ابن کثیر ج ۲ [2] طبری ۴۷۴

کرتے تھے (یہ سب باتیں یزید پر طنز تھیں)
سو یہ لوگ عنقریب آخرت کی بربادی سے
دوچار ہوں گے۔

بلاذری کی روایت میں حضرت عبداللہ بن زبیر کا جو بیان ہے اس میں یزید کے کردار کے بارے میں صراحت پائی جاتی ہے۔

فبسط ابن الزبیر لسانه فی یزید بن معاویه تنقصه وقال بلغنی انه یصبح سکران ویمسی کذلک[1]

عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید بن معاویہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں صبح اور نشہ کی حالت میں شام کرتا ہے۔

یزید کی تنقیص و مذمت پر ائمہ دین و علماء اسلام صدیوں سے متفق رہے ہیں اور جس کی شخصیت اہلِ دین کی نظروں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت رہی ہے، اور واقعۂ کربلا اور واقعۂ حرّہ کے بعد جس کی تعریف وتحسین کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، اس دور میں بعض اہلِ قلم اپنے سوادِ قلم سے اس کے سیاہ چہرہ کو پُرکشش بنانے اور سواد کو بیاض سے بدلنے کی سعیٔ لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں اور بالواسطہ طور پر ان صحابہ کرام کو بھی مجروح کر رہے ہیں جو میدانِ کربلا میں اور مدینہ منورہ میں یزید کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔

خود یزید کے بیٹے معاویہؒ بن یزید کی شہادت

تقلد ابی الامر وکان غیر اهله ونازع ابن بنت رسول الله صلی الله علیه وسلم فقصف عمره وانبتر عقبه وصار فی قبره رهینا بذنوبه یکی وقال

میرے باپ نے حکومت سنبھالی تو وہ اس کا اہل ہی نہ تھا۔ اس نے رسول اللہؐ کے نواسے سے نزاع کی۔ آخر اس کی عمر گھٹ گئی اور نسل ختم ہوگئی اور پھر وہ اپنی قبر میں اپنے گناہوں کی ذمہ داری لے کر دفن ہوگیا۔ یہ کہہ کر

---

[1] انساب الاشراف ج ۴ ص ۳۱

إن من اعظم الامور علینا علمنا بسوء مصرعه وسوء منقلبه وقد قتل عترة رسول الله واباح الخمر وخرب الكعبه [1]

رونے لگے جو بات ہم پر سب سے گراں ہے وہ یہی ہے کہ اس کا برا انجام اور بری عاقبت ہمیں معلوم ہے۔ اس نے رسول اللہ کے قرابت داروں کو قتل کیا شراب کو حلال کیا اور بیت اللہ کو ویران۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی شہادت

حدثنا نوفل بن ابی اقرب کنت عند عمر بن عبدالعزیز فذکر رجل یزید بن معاویه فقال امیر المومنین یزید فقال له عمر تقول امیر المومنین فأمر به فضرب عشرین سوطاً [2]

ہم سے نوفل بن ابی عقرب نے بیان کیا کہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص کی زبان سے یزید بن معاویہ کا ذکر کرتے ہوئے (احتراماً) امیر المومنین یزید کے الفاظ نکل گئے اس پر عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا تو! اس کو امیر المومنین کہتا ہے؟ پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کو بیس کوڑے لگائے جائیں چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

علامہ ابن تیمیہ کی شہادت

کونه عادلاً فی کل اموره مطیعاً لله فی جمیع افعاله لیس اعتقاد احد من ائمة المسلمین۔ [3]

یزید اپنے معاملات میں عادل تھا یا اپنے عمل و کردار میں خدا کا فرماں بردار تھا یہ ائمہ مسلمین میں سے کسی کا اعتقاد نہیں۔

---

[1] الصواعق المحرقہ ص ۱۳۴

[2] لسان المیزان۔ ترجمہ یزید بن معاویہ ج ۶۔ [3] منہاج السنۃ ص ۲۴۰ ج ۳

"وضع الید فی الید" کی روایت

حضرت حسینؓ کی پیش کردہ شرطوں میں سے ایک شرط وضع الید فی الید کو کچھ لوگ اپنے موقف کے لئے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آخر میں حضرت حسینؓ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے۔ عربی زبان و ادب کے ذخیرے سے ایک جملہ بھی ایسا نہ مل سکے گا جس سے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم بغیر کسی قرینے کے بیعت سمجھا جائے۔ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے سربراہ جب باہم ملتے ہیں تو وضع الید فی الید کا واقعہ ہی پیش آتا ہے۔ لیکن وہاں کوئی کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ فریق مخالف کے لوگ بھی گفتگو کے لئے باہم ملتے ہیں تو مصافحہ کرتے ہیں اور پنجہ آزمائی سے لے کر مباہلہ تک کے لئے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ امام حسینؓ جیسی شخصیت جو شروع سے بیعت کے خلاف ہو کرب و بلا کے اندیشے سے فوراً بیعت کے لئے یا سر جھکانے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے سے مراد نہ تو بیعت و انقیاد ہے اور نہ مقابلہ و پنجہ آزمائی بلکہ مراد اصل حریف سے نفس معاملہ پر گفتگو ہے۔ اصل عربی عبارت یہ ہے:

ان اضع یدی فی ید یزید بن معاویہ فیری فیما بینی و بینہ رایہ	میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دوں پھر وہ دیکھے میرے اور اس کے درمیان اس کی کیا رائے ہوتی ہے۔

اس عبارت سے بیعت مراد نہیں بلکہ نفس قضیہ پر گفت گو مراد ہے۔

امام حسینؓ کی وضع الید فی الید کی تجویز بعینہ وہی تجویز ہے جو حرؓ بن یزید تمیمی نے پیش کی تھی۔ مقام ذی حشم میں وہ جب ایک ہزار سپاہ کے ساتھ آپ سے ملا تو اس نے یہ کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ نہیں چلتے تو ایسا راستہ اختیار کیجئے جو عراق اور حجاز دونوں کے راستہ سے جدا ہو۔ میں ابن زیاد کو لکھتا ہوں آپ یزید کو لکھئے ممکن ہے مفاہمت کی صورت نکل آئے اور میں بھی آزمائش سے بچ جاؤں۔ امام حسینؓ اس تجویز پر راضی ہو گئے۔ یہی وہ تجویز تھی۔ جسے

وضع الید فی الید کے الفاظ میں امام حسینؓ نے پیش کی تھی۔ اس سے مفاہمت کی گفت گو مراد ہے نہ کہ بیعت۔

اگر وضع الید فی الید سے مراد بیعت انقیاد ہوتی تو اس تجویز کو قبول کرنے کے بعد فوراً وہ خطبہ نہ دیتے جو اوپر نقل کیا گیا ہے اور جس میں اپنے اقدام کی شرعی اہمیت انھوں نے پوری قوت کے ساتھ پیش کی اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک گیری کی ہوس کے لئے نہیں نکلے تھے۔

زیادہ سے زیادہ اس پیشکش سے مراد استسلام (Surrender) ہو سکتا ہے ایک کمزور فوج اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج کے مقابلہ میں استسلام کی پیش کش کر سکتی ہے اور بات چیت کے ذریعہ اصولی اختلافات کے حل کا راستہ نکالنے کی دعوت دے سکتی ہے۔

"وتواصوبالحق وتواصوبالصبر" پر عمل کا نمونہ

واقعہ یہ ہے کہ اقدام امام حسینؓ حق اور صبر پر تلقین کا بہترین نمونہ ہے۔ قرآن میں گھاٹے اور خسران سے بچنے والوں کے اوصاف میں وتواصوابالحق وتواصوابالصبر آیا ہے۔ حق اور صبر کی تلقین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں کنبے اور محلے سے لے کر نظام حکومت کی تبدیلی کا مفہوم اس میں شامل ہے نظام وقت اور نظام حکومت کی تبدیلی کی کوشش فرض عین نہیں ہے کہ ہر شخص اس کا مکلف ہو۔ یہ وہ فرض کفایہ ہے جس کا بہر حال کچھ لوگوں کو بیڑا اٹھانا چاہیئے اور اس فرض کفایہ کے ادا کرنے والے پوری امت کی طرف سے احترام اور شکریے کے مستحق ہوں گے۔ بصورتِ دیگر پوری امت کو اس کی جواب دہی کرنی ہو گی لیکن یہ فرض کفایہ ان نفوسِ قدسیہ کے لئے جو اپنے اندر اس کام کی اہلیت و لیاقت پائیں، فرض عین بھی بن جاتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے ۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

وہ اسپرٹ آج بھی باقی ہے

یہ ہے واقعہ کربلا کا دینی اور نظریاتی پس منظر۔ اس کی عظمت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کی اسپرٹ آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں باقی ہے اور اس نے پوری اسلامی تاریخ میں حکمراں طبقے کو لگام دیتے اور غلط روی پر بریک لگانے کی خدمت انجام دی ہے۔ اگر اس طبقے کو جس کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہے مکمل اطمینان ہو جائے کہ نہ کوئی اس سے باز پرس کرنے والا ہے نہ بے خوفی کے ساتھ کلمۂ حق کہنے والا تو وہ طبقہ اپنی من مانیوں اور مفسدہ پردازیوں پر اور بھی شیر اور دلیر ہو جائے گا۔

آج کے اس دور میں بھی سنوسی تحریک اور اخوان المسلمون کی دعوت سے لے کر جہادِ افغانستان تک وہی شوقِ شہادت اور سرفروشی کی روح پائی جاتی ہے جس کا نمونہ سیکڑوں سال پہلے ہمارے بزرگوں نے پیش کیا تھا۔ ان ہی کے فیض سے اہلِ ایمان کا ضمیر ہمیشہ زندہ اور تازہ کار رہا ہے۔ اگر ان کے نمونے نہ ہوتے تو اسلام کی تاریخ تملق، چاپلوسی، اور مداہنت کی تاریخ ہوتی خاک کے آغوش میں بس تسبیح ومناجات باقی رہ جاتی جو جمادات ونباتات زاحفات وحشرات کا دین ہے۔ وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا نمونہ کہیں نظر نہ آتا جو مردانِ احرار وحق آگاہ کا مذہب ہے۔

آخر میں ایک بات اور

واقعۂ کربلا یا کسی بھی اسلامی تاریخ کے واقعہ کو سمجھنے اور اس پر صحیح تبصرہ کرنے

کے لئے سب سے پہلے صحیح زاویۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں دینِ اسلام کی ایک حیثیت تو وہ ہے جو نمونہ اور معیار کی ہے۔ یہ وہ دین ہے جس میں اس کے داخلی تقاضے اور خارجی تقاضے دونوں بدرجہ اتم پورے ہوتے ہیں، انفرادی سطح پر معاشرہ میں تقویٰ اور خوفِ خداوندی موجود ہوتا ہے ذکر وعبادت سے فضا معمور ہوتی ہے اور اجتماعی سطح پر اسلامی قوانین پر عمل ہو رہا ہوتا ہے معاشرت اور سیاست کا نظام اسلامی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے اور اس نظام میں رخنہ اندازی نہیں ہوتی ہے۔ اسلام کی اشاعت وجہاد کا کام انجام پاتا ہے۔ دینِ اسلام کی دوسری حیثیت وہ ہے جو نمونہ اور معیار تو نہیں ہے لیکن وہ کام چلاؤ اور عام طور پر معمول بہ دین ہے۔ اس معمول بہ دین میں ذکر و شغل اور تسبیح وتلاوت اور اپنے اپنے محدود حلقوں میں تذکیر اور تزکیۂ نفس کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اقتدارِ وقت پر دین کی بالادستی باقی نہیں رہتی جس کے اثرات معاشرہ پر پڑنے لگتے ہیں۔ علامہ اقبال نے دونوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

اگر حالات سازگار نہ ہوں اور فتنہ قوی ہو چکا ہو اور عزیمت بھی مفقود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ معمول بہ دین پر عمل کر لیا جائے۔ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے لا یکلف نفساً الا وسعہا لیکن یہ تو نہ ہونا چاہئے کہ ایک انسان معمول بہ دین کے فلسفہ کا مبلغ بن جائے اور جو نمونہ اور معیار ہے اس کی آرزو تک باقی نہ رہے

ایک مرض اور اس کے اسباب

پہلے یہ چند حدیثیں پڑھ لیجئے

۱۔ احب اھل بیتی الحسن والحسین[1] مجھے اپنے اہلِ بیت حسن اور حسین سے محبت ہے۔

---

[1] ترمذی

۲۔ عن زید بن ارقم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لعلی و فاطمہ والحسن والحسین انا حرب من حاربھم و سلم لمن سالمھم

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا جو ان سے لڑے میری ان سے لڑائی ہے اور جو ان سے صلح کرے میری ان سے صلح ہے۔[1]

۳۔ ھماریحانتای من الدنیا

حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما میری دنیا کے دو پھول ہیں۔[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو یہ نصیحت کی:

۴۔ ارقبوا محمداً صلی اللہ فی اھل بیتہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ معاملہ کرنے میں آپ کا پاس و لحاظ رکھو۔[3]

بخاری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی مذکور ہے:

"قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ قرابت سے صلہ رحمی کرنا مجھے اپنے اہلِ قرابت کی صلہ رحمی کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں قرابت رسول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

۱۔ رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ج۲ ص۵۷۰

۲۔ صحیح بخاری مناقب الحسن والحسین

۳۔ بخاری باب مناقب قرابۃ رسول اللہ

من ینسب لعبد المطلب مؤمناً کعلی وبنیہ	جس مسلمان کا رشتہ نسب عبد المطلب سے ملتا ہو جیسے علیؓ اور ان کے دونوں لڑکے

اوپر کی روایات اور احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہلِ بیت بالخصوص حضرات حسنین پر بے اندازہ شفقت فرماتے تھے۔ گذشتہ بحثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ ہر دور میں ائمہ فقہاء اور محدثین اور علماء جگر گوشہ رسول سے محبت اور یزید سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ علمِ کلام اور عقائد کی کتابوں میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ حق حضرت حسینؓ کے ساتھ تھا۔ اس بات کو عقیدہ کا جزء اس لئے غالباً بنا دیا گیا کہ یہ اندیشہ موجود تھا کہ مسلمانوں کو اس بارے میں گمراہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ شرح عقائد نسفی میں ہے:

والحق ان رضا یزید بقتل الحسین واستبشاره بذلک واهانته اهل بیت النبی علیه السلام مما تواتر معناه وان کان تفاصیلها احاداً [1]	اور حق یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر یزید کا راضی ہونا اور اس پر خوش ہونا اور اہلِ بیت نبوی کی اہانت کرنا ان تمام امور کی تفصیلات گو بطریق احاد مروی ہوں لیکن معنی کے لحاظ سے متواتر ہیں'

ان احادیث اور ائمہ وعلماء کی تصریحات کی موجودگی میں حضرت حسینؓ کے اقدام کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرنا یا واقعۂ کربلا کی اہمیت کو گھٹانا اور یزید کی طرف سے صفائی پیش کرنا ایک طرح کا نفسیاتی مرض ہے۔ اس مرض میں گرفتار لوگوں کے ذہن وفکر کا جائزہ لیا جائے اور تحلیلِ نفسی کی جائے تو درجِ ذیل اسباب میں سے کوئی ایک سبب ضرور نکل آئے گا۔

۱۔ تصورِ دین کی غلطی، یعنی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لینا کہ دین کا معاملہ ایک انفرادی معاملہ ہے اور ایک فرد کے لئے ذاتی زندگی کی اصلاح تقویٰ اور تعلق مع اللہ کافی ہے۔ خلیفہ کیسا ہو عقدِ خلافت صحیح طریقے سے ہو یا جبر واستبداد کے ذریعہ یہ اور دیگر سیاسی معاملات کا براہِ راست دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے یزید کی مخالفت کرکے حضرت

---

[1] شرح عقائد نسفیہ ۱۴۷ طبع مصر

حسینؓ نے بے جا اپنے کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنی جان گنوائی۔

۲۔ شیعیت کے معاملہ میں حد سے بڑھی ہوئی حساسیت۔ یعنی ردِ شیعیت میں اتنا غلو کہ اہلِ بیت سے اور خاص طور پر سبطِ رسول سے والہانہ محبت کا اگر کسی نے اظہار کیا اور یزید پر لعنت و ملامت کی تو اس میں شیعیت کی بو اور خو محسوس ہونے لگے اور ایسے جذبات کا رشتہ فوراً شیعیت سے جوڑ دیا جائے۔ یا زبان سے یہ بات نہ کہی جائے لیکن خود انسان کا سینہ نقدِ شیعیت میں انتہا پسندی کی وجہ سے اس طرح کے لطیف جذبات سے بالکل خالی ہو جائے اور حضرات حسنینؓ سے واقعی محبت دل میں نہ پائی جائے۔

۳۔ تیسرا سبب حد سے بڑھی ہوئی عقلیت اور عشقِ رسول میں کمی یا اس سے محرومی کا روگ ہے جو مغربی تہذیب کے استیلاء کے دور میں ترقی پذیر ہے۔ کچھ لوگوں میں تو دل میں چھپا ہوا روگ زبان پر بھی آجاتا ہے اور یہ کہا جانے لگا ہے کہ ہمیں تو محمد رسول اللہ سے غرض ہے نہ کہ محمد بن عبداللہ سے۔ یعنی ذاتِ گرامی کی تشریعی حیثیت سے بحث ہے نہ کہ آپ کی ذاتی زندگی سے۔ اس لئے آپ کی سنتوں کا اتباع اور آپ کی محبوب چیزوں کو محبوب رکھنا اور آپ کے اسوۂ حیات سے عشق ایک غیر ضروری چیز ہے۔ جب یہ معاملہ رسول کے ساتھ ہے تو سبطِ رسول سے محبت کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے اور جب عشق و محبت نہیں تو اس بارے میں غیرت و حمیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ غیرت کا گہرا تعلق عشق سے ہے۔ لیکن ابھی تک مخالفین حسینؓ اور مؤیدین یزید میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو زبان سے یہ بات تو نہیں کہتے لیکن اگر وہ خود اپنے دلوں کا جائزہ لیں گے تو محسوس ہو گا کہ محبت اہلِ بیت یا تو سرے سے نہیں ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔

سچ یہ ہے کہ عشقِ نبوی کا معاملہ محض جذباتی معاملہ نہیں ہے بلکہ اس کی تشریعی حیثیت ہے اور اس محبت کے لئے نص صریح موجود ہے اور اس محبت میں کمی نہ پیدا ہونے کے لیے خصوصی احکامات نازل فرمائے گئے ہیں۔ دین کے اصل مزاج کے بقاء اور تسلسل اور اس امت کی حفاظت کے لئے اس عشق و محبت کی حیثیت مستحکم قلعہ کی ہے اور اس کے بغیر نہ دین کی حفاظت ہو سکتی ہے اور نہ دین سے وابستہ امت کی۔

تاریخی مطالعہ یا معروضی مطالعہ کے حوالے سے واقعۂ کربلا کی اہمیت کو گھٹانے اور حضرت حسینؓ کے سرفروشانہ اقدام کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کرنے والوں میں مذکورہ تین اسباب میں سے کوئی ایک سبب ضرور مل جائے گا اور دینی روحانی اور سماجی علوم کے لئے بھی کوئی خورد بینی کا آلہ موجود ہوتا تو ان جرثوموں میں سے کوئی ایک جرثومہ ضرور دیکھ لیا جا سکتا۔

دین کے بارے میں صحیح اور متوازن تصور کو ذہن میں جاگزیں کرنا اور جمہور اہل سنت کے موقف کی صحت پر یقین اور عشق کے آبِ حیات سے تخمِ دل کی آبیاری نہ صرف واقعۂ کربلا کے غلط مطالعہ کے سلسلہ میں نفسیاتی مرض کا علاج ہے بلکہ یہ بہت سے فکری اور نفسیاتی امراض کا علاج بھی ہے۔ یہ وہ نسخۂ شفا ہے جس سے قلب و نظر کی بیماریوں کے بہت سے مریض شفایاب ہو سکتے ہیں۔

احتساب کی یادگار مثالیں اور علمائے حق کے نمونے

نظریہ احتساب پر تنقید کے پس پردہ مقصد یہ ہے کہ تاریخ اسلام میں حکومت وقت پر تنقید اور احتساب کی تمام کوششوں کو خلافِ اسلام ثابت کر دیا جائے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی مقاومت کو بھی تنقید کا ہدف بنایا جا چکا ہے۔ نظریہ احتساب کو منہدم کرنے کے بعد ان تمام اسلامی تحریکات کو مطعون کرنا آسان ہو جاتا ہے جو خلافت علی منہاج النبوۃ کا مطالبہ کرتی آئی ہیں یا حکومت کی روش کو اسلامی تعلیمات کے مطابق دیکھنا چاہتی ہیں۔ اور پھر اس کے بعد توافق ایڈجسٹمنٹ، پسپائی اور ہزیمت کے فلسفہ کی اشاعت بے روک ٹوک ممکن ہو جاتی ہے۔ ہم مسلمانوں کے لئے قرآن و سنت کے بعد صحابہ کرام تابعین اور تبع تابعین کی زندگی نمونہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم	سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر اس کے وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے پھر اس کے بعد وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے

آیئے پیچھے کی طرف لوٹیں اور دیکھیں کہ ہزار سال پہلے جو لوگ مشکوٰۃ نبوت سے براہِ راست

اکتساب نور کر چکے تھے یا اکتساب نور کرنے والوں کے دیدار سے مشرف ہو چکے تھے۔ یا دیدار کرنے والوں کا دیدار انھوں نے کیا تھا، ان کا دین احتساب و جہاد کا دین تھا یا نہیں۔ اور انھوں نے سیاسی و اجتماعی نظام کی اصلاح کی جد وجہد کی تھی یا نہیں کی تھی۔

۱۔ واقعہ کربلا کے پیش آنے کے بعد عالم اسلام میں رنج اور قلبی اذیت کی لہر دوڑ گئی۔ مذہبی حلقہ یزید اور بنی امیہ کا مخالف تھا۔ نئے سرے سے اجتماعی اور سیاسی نظام کی چول اپنی جگہ بٹھانے اور واقعہ کربلا کا انتقام لینے کے لئے اطراف ملک میں ہر طرف تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں ان تحریکوں میں سب سے نمایاں تحریک حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تھی وہ عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کا پیکر تھے ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ان کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز کی تصویر تھی۔ اس سکون و استغراق کے ساتھ نماز پڑھتے تھے کہ قیام کی حالت میں بے جان ستون معلوم ہوتے تھے رکوع اتنا طویل ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ سورہ بقر ختم کر دیتے تھے اور ان کا رکوع ختم نہ ہوتا سجدہ کی طوالت سے پرندے ان کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے تھے۔ خانہ کعبہ کے محاصرے کے زمانہ میں جبکہ ہر طرف سنگ باری ہو رہی تھی وہ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ حطیم میں نماز پڑھتے تھے۔ روزے اور حج وغیرہ تمام ارکان سے یہی ذوق و شغف تھا۔ سنتِ نبوی کا رشتہ ہاتھ سے کبھی چھوٹتا نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی یہ زاہدانہ و عابدانہ زندگی عبادت کے داخلی تقاضوں کا مظہر تھی۔ عبادت کے خارجی تقاضوں کا مظہر ان کا یہ انقلابی کارنامہ ہے کہ جادۂ شریعت سے منحرف ہوتی ہوئی حکومت کی راہ میں وہ مزاحم ہو گئے اور جب قوتِ مزاحمت ختم ہو گئی اور انھوں نے دیکھا کہ حجاج ابن یوسف کی منظم فوج سے مقابلہ جاری رکھنے کی کوئی اور صورت باقی نہیں اور ان کے ہزاروں ساتھی یا تو شہید ہو چکے ہیں یا ساتھ چھوڑ چکے ہیں تو وہ اپنی والدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے تمام ساتھی جدا ہو چکے جو تھوڑے سے جاں نثار باقی رہ گئے ہیں ان میں مقابلے کی تاب نہیں اور دشمن رعایت دینے کے لئے آمادہ بھی ہے۔ ایسی حالت میں آپ کیا فرماتی ہیں؟

اس سوال پر صدیق اکبرؓ کی بیٹی نے اپنے بیٹے کو جو جواب دیا اس پر عورتوں کی تاریخ ہمیشہ فخر کرے گی۔ انھوں نے کہا:

"تم کو اپنی حالت کا اندازہ خود ہوگا اگر تم حق پر ہو اور حق کے لئے لڑتے ہو تو اب بھی اس کے لئے لڑو کہ تمھارے بہت سے ساتھیوں نے اس کے لئے جان دی ہے۔ اور اگر دنیا طلبی کے لئے لڑتے تھے تو تم سے برا کون خدا کا بندہ ہوگا کہ خود کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنے ساتھ کتنوں کو ہلاک کیا۔ اور اگر یہ عذر ہے کہ حق پر ہو لیکن اپنے مددگاروں کا ساتھ چھوڑنے کی وجہ سے مجبور ہوئے تو یاد رکھو کہ یہ شریفوں اور دین داروں کا شیوہ نہیں۔ تم کو کب تک دنیا میں رہنا ہے۔ جاؤ حق پر جان دینا دنیا کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی والدہ سے عرض کیا:

"اماں مجھے خوف ہے کہ میرے قتل کے بعد بنی امیہ میری لاش کو مثلہ کر کے سولی پر لٹکائیں گے۔"

بہادر ماں نے جواب دیا:

"ذبح ہو جانے کے بعد بکری کو کھال کھینچنے سے تکلیف نہیں ہوتی۔ جاؤ خدا سے مدد مانگ کر اپنا کام پورا کرو۔ میں ہر حالت میں صبر و شکر سے کام لوں گی۔ تم مجھ سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تو صبر سے کام لوں گی اور اگر کامیاب ہوئے تو تمھاری کامیابی پر خوش ہوں گی۔"

پھر بیٹے کو انھوں نے دعائیں دیں اور گلے لگا کر رخصت کیا اور کہا کہ جاؤ بسم اللہ اپنا کام پورا کرو۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہو گئے اور ان کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ حجاج نے لاش سولی پر لٹکائی۔ کئی دن کے بعد حضرت اسماء کا ادھر سے گذر ہوا تو انھوں نے سولی پر لٹکی ہوئی لاش کو دیکھ کر فرمایا۔

"کیا یہ سوار سواری سے نہیں اترا۔"

خلافتِ راشدہ کے بعد جو استبدادی نظام قائم ہوا تھا اور نظام حکومت میں جو خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں تھیں عباسی دوران خرابیوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ دین سے آزاد ہو کر ایک فاسقانہ تمدن معاشرے میں برگ و بار لا رہا تھا اور ایک رندانہ ثقافت تھی جو پروان چڑھ رہی تھی۔ لہو و لعب کا قافلہ شریعت کے حدود و قیود کو پامال کرتا ہوا دینی روایات کو توڑتا ہوا سیل سبک سیر و زمیں گیر کی طرح مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ اعتقادات سے لے کر اخلاقیات تک کے معاملوں میں بھی آزادی

آزادروی اور آزاد خیالی وقت کا فیشن بن چکی تھی۔ اور اکثر یہ سب کچھ حکومت وقت کی زیر پرستی ہو رہا تھا۔ المامون کے مصنف علامہ شبلی کا قلم خلیفہ وقت مامون کے دربار کا منظر کھینچتا ہے۔

"بزم عشرت میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھا ہے۔ بے تکلف اور رنگین احباب جمع ہیں۔ پری پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے، دور شراب چل رہا ہے، ساز چھیڑا جا رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں، یاران باصفا بدمست ہوتے جا رہے ہیں" (المامون صفحہ ۲۰۱)

بادشاہوں کی تاریخ کو اسلامی تاریخ سمجھنے والوں کے لئے یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ دینی طبقے کی کلیدی شخصیتوں نے جن کی حیثیت وارثین انبیاء کی تھی، غیر اسلامی نظام کی مخالفت کی تھی۔ اس طبقے نے یا تو انقلاب کی کوشش کی تھی یا انقلاب کی کوششوں میں اپنا تعاون پیش کیا تھا اس سیاسی نظام کے ماتحت عہدۂ قضا کو بھی جو ایک خالص دینی عہدہ تھا قبول کرنے سے اہل دین اور تقوی شعار علماء کو انکار تھا۔ یہ علماء حق کی طرف سے گویا عدم تعاون کی تحریک تھی۔ مزاحمت و مقاومت کی اکثر تحریکیں بظاہر ناکام ہو گئیں لیکن ان کی یہ کامیابی کیا کم ہے کہ رہتی دنیا تک کے لئے دین کا صحیح اور جامع تصور اس امت کے ذہن میں باقی رہ گیا اور ایک مسلم اکثریت کے ملک اور معاشرے میں دین کو اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ جاری و ساری کرنا علماء امت کا مقصدِ زندگی قرار پایا۔

ائمہ دین اور علماء حق حکومت اور اسلامی معاشرہ دونوں کی اصلاح اور احتساب کے کام میں مصروف تھے اور عوام کی نظروں میں اعتماد ایسے ہی علماء کو حاصل تھا اور علماء کی مخالفت سے حکومت بھی خوفزدہ ہوتی تھی۔ اربابِ اقتدار اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ علماء کو بلند عہدے دیئے جائیں تاکہ حکومت کی ساکھ باقی رہے۔ کبھی کبھی بعض حاکمان وقت علماء کو جاہ و منصب کے قفص زریں میں قید کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ عیش و تنعم کی زندگی سے خوگر ہو کر کار احتساب اور حق گوئی و بے باکی سے غافل ہو جائیں بنو امیہ سے لے کر بنو عباس تک جاہ و منصب کا دام ہم رنگ زمیں ان کے لئے پھیلایا گیا۔ لیکن ایمان و احتساب کی روح سے سرشار علماء حق کا طبقہ جس نے خیر القرون کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان کبوتروں کی طرح نہ تھا جو دانوں پر اترتے ہیں اور دام تزویر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ تو وہ نفوسِ قدسیہ تھے جو مزاج نبوت کے اداشناس تھے۔ فاقہ ان کی دل پسند غذا تھی

ان کے جام شراب عیش و عشرت سے تہی لیکن غیرتِ ایمانی کی مے سے لبریز تھے۔ وہ اس عقاب کی مانند تھے جو پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے۔ انھوں نے منہاج السنہ سے منحرف سیاسی ڈھانچے میں عہدہ و اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور زبانِ حال سے یہ کہہ دیا کہ ؎

بردایں دام برمرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

۲۔ علمارِ حق کے طبقے نے احتساب اور امر بالمعروف سے غفلت نہیں برتی۔ انھوں نے شاہی طمطراق اور حکومت کے کر وفر کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں جن کو عوام صرف ایک روحانی شخصیت سمجھتے ہیں تاریخ میں یہ موجود ہے۔

کان یامر بالمعروف وینھی عن المنکر للخلفاء والوزراء والسلاطین والقضاۃ والخاصۃ والعامۃ یصدعھم بذلک علی رؤس الاشھاد ورؤوس المنابر وفی المحافل وینکر علی من یولی الظلمۃ ولا تاخذہ فی اللہ لومۃ لائم

آپ خلفار، وزرار سلاطین و قضاۃ، خواص و عوام سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے اور بڑی صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور بر سر ممبر علی الاعلان ٹوک دیتے اگر کسی ظالم کو حاکم بنایا جاتا تو اس پر اعتراض کرتے اور خدا کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوئی۔

(قلائد الجواہر بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت صفحہ ۱۹۸)

۳۔ یہ شیخ الاسلام عزالدین بن سلام ہیں انھوں نے ان امرار سلطنت کو بازار میں نیلام کر دیا تھا جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے اور شرعی طریقے پر آزاد نہیں کئے گئے تھے۔ یہ امرار سلطنت مصر پر حاوی تھے ان میں سے ایک نائب السلطنت بھی تھا۔ شیخ نے یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ یہ امرار جب تک شرعی طریقے پر آزاد نہ ہوں ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں اور وہ عام غلاموں کے حکم میں ہیں۔ امرار سلطنت کو بادل ناخواستہ اور طویل کشمکش کے بعد شیخ الاسلام کے فتوے کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور شیخ نے ان امرار کو نیلام کر ڈالا ہر ایک پر بولی بولی گئی جب وہ شرعاً آزاد ہو چکے تو پھر اپنی مسندوں پر متمکن ہوئے۔

۴۔ فقہ کے ائمہ اربعہ کو دیکھئے جن کا سکہ سارے عالم اسلام پر چلتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ

ہیں کہ اسلامی دنیا کا غالب حصہ دینی مسائل میں انھیں کے فقہ کا پیرو کار ہے۔ جب ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں حضرت زید بن علی نے استبدادی نظام کا تختہ پلٹنا چاہا تو امام ابو حنیفہ نے ان کی تائید کی اور مالی مدد کے طور پر دس ہزار روپے ان کی خدمت میں بھیجے۔ خلفاء بنو امیہ کو احساس تھا کہ حکومت اگرچہ بہت طاقتور ہے لیکن اس کا مذہبی اعتبار اور وقار مجروح ہوا ہے اور ایوان حکومت مذہبی ستونوں پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔ ہشام کی وفات کے بعد خلیفہ یزید الناقص نے امام صاحب کو افسر خزانہ یا اسی طرح کا بلند عہدہ دینا چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ یزید نے قسم کھا کر کہا کہ آپ کو منظور کرنا ہوگا مگر امام صاحب اپنے انکار پر مصر رہے۔ یزید نے غصے میں آکر حکم دیا کہ ہر روز دس درے لگائے جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوئی لیکن وہ اپنے انکار سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر یزید نے انھیں چھوڑ دیا۔ اسی دور کے گورنر ابن ہبیرہ نے حکومت کے ایما سے امام صاحب کو مجبور کیا کہ وہ شاہی توشہ خانے کی نگرانی قبول فرمالیں، انھوں نے انکار کیا، ابن ہبیرہ نے قسم کھا کر کہا آپ کو یہ خدمت قبول کرنی پڑے گی۔ امام صاحب نے اسی طرح جوابی قسم کھائی کہ وہ ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ گورنر ابن ہبیرہ نے حکم دیا کہ ان کو کوڑے مارے جائیں۔ تین سو کوڑے ان کو اس انداز سے لگائے گئے کہ بقول امام ابو یوسفؒ گوشت کے بھی ٹکڑے ہوگئے۔ خلیفہ منصور کے زمانے میں ظالمانہ حکومت کے خلاف نفس زکیہ کے بھائی جناب ابراہیم نے علم بغاوت بلند کیا وہ بڑے پائے کے عالم اور مقتدائے عوام و خواص تھے۔ ان کی دعوائے خلافت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مذہبی گروہ علماء و فقہاء نے ان کا ساتھ دیا۔ امام ابو حنیفہ نے کھل کر ان کا ساتھ دیا اور ان کو یہ خط لکھا۔

امابعد، فانی قد جهزت الیک اربعة الاف درهم ولم یکن عندی غیرها ولولا امانات الناس عندی للحقت بک فاذا لقیت القوم وظفرت بهم فافعل کما فعل ابوک فی اهل الصفین. اقتل مدبرهم واجهز علی جریحهم ولا تفعل کما فعل ابوک فی اهل الجمل فان القوم لهم فئة۔

میں آپ کے پاس چار ہزار درہم بھیجتا ہوں کہ اس وقت اسی قدر موجود تھے۔ اگر لوگوں کی امانتیں میرے پاس رکھی نہ ہوتیں تو میں ضرور آپ سے آملتا۔ جب آپ دشمنوں پر فتح پائیں تو وہ برتاؤ کریں جو آپ کے والد (حضرت علی) نے صفین والوں کے ساتھ کیا تھا۔ زخمی اور بھاگ کر جانے والے سب قتل کئے جائیں۔ وہ طریقہ اختیار کیجئے گا جو آپ کے والد نے جنگ جمل میں جائز رکھا تھا کیونکہ مخالف بڑی جمعیت رکھتا ہے۔

منصور نے ان کو اپنے پاس بلایا اور اپنی حکومت کے دستوری اور شرعی حیثیت کے بارے میں استفسار کیا۔ امام نے جواب دیا۔

"دیکھو تم نے خلافت کی باگ ایسے وقت میں سنبھالی ہے کہ فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھنے والوں میں سے دو آدمی بھی تمہاری خلافت پر متفق نہیں ہوتے تھے اور تم جانتے ہو کہ خلافت ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر امت کا اجماع ہی کچھ طے کر سکتا ہے انھیں کے مشورے سے خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے"

منصور کے زمانے میں جب موصل کے باشندوں نے بغاوت کی تو سلطنت کے قاضیوں سے یہ فتویٰ چاہا گیا کہ باغیوں کو مباح الدم قرار دے دیا جائے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے اس کی سخت مخالفت کی جب خلیفہ منصور نے باغیوں پر قابو پالیا اور بغداد کو دارالحکومت بنالیا تو امام ابوحنیفہ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً پایہ تخت پر حاضر ہوں۔ جب وہ دربار میں حاضر ہوئے تو حاجب نے ان کا تعارف ان لفظوں میں کرایا۔ "یہ دنیا میں آج سب سے بڑا عالم ہے"

منصور نے ان کے لئے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ امام نے انکار کیا اور کہا کہ "مجھ میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا" منصور نے غصے میں آکر کہا کہ "تم جھوٹے ہو" امام صاحب نے جواب دیا۔

"اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعویٰ سچا ضرور ہے کہ میں عہدۂ قضا کے قابل نہیں کیونکہ ایک جھوٹا شخص قاضی مقرر نہیں ہو سکتا"

منصور نے امام صاحب کو قید کر دیا اور امام صاحب کی رہائی قید کی زندگی سے اسی وقت ہوئی، جب زندگی کی قید سے اللہ نے ان کو رہا کر دیا۔

۵ ۔ یہ امام مالک ہیں جن کا لقب امام دارالہجرہ ہے۔ یہ محمد بن عبداللہ ذوالنفس الزکیہ کے طرفداروں میں سے تھے۔ نفس زکیہ خلیفہ منصور عباسی کے مقابلے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ علامہ ابن الاثیر کی تاریخ الکامل میں مذکور ہے کہ امام مالک بن انس سے محمد ذوالنفس الزکیہ کے جہاد میں ساتھ دینے یا نہ دینے کے سلسلے میں فتویٰ مانگا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا اس بغاوت کا ساتھ دینا جائز ہے اس حال میں کہ خلیفہ کی بیعت کا قلادہ ہماری گردنوں میں ہے۔ امام مالک نے اس فتوے کا جواب دیا۔

"تم لوگوں سے زبردستی بیعت لی گئی ہے اور مکرہ (جس سے بجبر کوئی کام لیا جائے) کی قسم کا اعتبار نہیں"

اس فتوے کے بعد لوگ محمد ذو النفس الزکیہ سے جا کر مل گئے اور امام مالکؒ اپنے گھر میں بند ہو گئے۔

امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ دو جلیل القدر امام اور عالم ہیں، کتاب و سنت کے ذخیرے سے سب سے زیادہ واقف ہیں اور تفقہ فی الدین کی دولت سے بہرہ یاب ہیں۔ اقتدارِ وقت کے خلاف ان دونوں بزرگوں کی مزاحمت کی تحریک کا ساتھ دینا ان کی دینی بصیرت کا آئینہ دار ہے اور مسلمانوں کے لئے جو ان کے فقہ کی پیروی کرتے ہیں حجت بھی ہے۔

۶ - امام احمد بن حنبل فریضۂ احتساب سے ذرا بھی غافل نہ تھے۔ انھوں نے مامون کا زمانہ پایا جو یونانی فلسفہ اور اعتزال سے مرعوب تھا اس کے زمانے میں مذہب اعتزال کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ اور مامون خود بھی اس مذہب کا پرجوش داعی بن گیا تھا۔ عقیدہ خلق قرآن اس وقت معتزلہ کے نزدیک حق اور باطل کا معیار تھا محدثین اس مسئلے میں معتزلہ کے مخالف اور حریف تھے۔ محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبل حق کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ انھوں نے عقیدہ خلق قرآن کی برملا مخالفت کی مامون کے بعد معتصم باللہ نے خلق قرآن کے مسئلے پر حکومت کے موقف کی مخالفت کرنے پر ان کو تازیانے لگوائے۔ لیکن یہ تازیانے ان کے پایۂ استقامت کو ہلا نہ سکے اور آخر تک وہ وہی بات کہتے رہے جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کو ۲۸ کوڑے لگائے گئے۔ ایک تازہ جلاد صرف دو کوڑے لگاتا تھا پھر دوسرا جلاد بلایا جاتا تھا۔ امام احمد بن حنبل ہر کوڑے پر فرماتے تھے۔

"اعطونی شیئامن کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ"

یعنی مجھے کتاب اللہ یا سنتِ نبوی سے کچھ دکھاؤ جسے میں اپنی زبان سے کہہ سکوں

ان کو ۲۸ مہینے قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑی۔

یقیناً کچھ دینی شخصیتوں نے حکومت کے عہدے قبول کئے اور وہ حکومتی مناصب پر فائز ہوئے۔ لیکن کئی شخصیتوں کے بارے میں تاریخ میں یہ ریکارڈ موجود ہے کہ یہ ان کے لئے اضطرار کی حالت تھی اور رخصت پر عمل کرنا انھوں نے منظور کیا تھا۔ لیکن بلند و بالا عہدے حاصل کرنے کے باوجود انھوں نے دین کی اور علم کی لاج رکھی اور ضمیر کی زندگی کا ثبوت دیا۔ قاضی حفص بن غیاث کا بیان ہے کہ جب حالات نے مردار کھانا میرے لئے حلال کر دیا تب میں نے قضا کا عہدہ قبول کیا۔ (تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۶۷)

امام ابو یوسفؒ جن کی مشہور کتاب "کتاب الخراج" ہے نظام حکومت کی اصلاح کا منصوبہ

لے کر قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ لیکن یہ اقدام بھی انھوں نے اس وقت کیا تھا جب ان کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی اور گذر اوقات کے لئے انھیں سسرالی مکان کی شہتیر اور اثاثہ کو فروخت کرنا پڑا تھا۔ انھوں نے قاضی القضاۃ کا عہدہ برضا و رغبت اور بہ طیب خاطر قبول نہیں کیا تھا۔ ان علمار حق نے علم دین کے وقار کو مجروح ہونے سے بچایا اور قضاء اور افتاء کے معاملے میں حکومت کی دخل اندازی کو برداشت نہیں کیا۔

۷۔ قاضی خیرؒ نے ایک فوجی سپاہی کو گالیاں دینے کے الزام میں حوالات میں بند کردیا۔ مصر کے گورنر عبدالملک بن یزید نے آدمی بھیج کر اسے حوالات سے نکلوایا۔ قاضی خیر عدلیہ کے کام میں حکومت کی اس مداخلت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مستعفی ہوگئے۔ بعد میں عبدالملک نے معذرت کی اور قاضی خیر کو دوبارہ قبول قضا پر آمادہ کرنا چاہا مگر انھوں نے جواب دیا کہ جب تک ملزم حوالات میں واپس نہیں ہوگا وہ استعفا واپس نہیں لیں گے مگر نہ گورنر جھکا اور نہ قاضی صاحب منصب پر واپس آئے۔

(امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۷۱)

۸۔ سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ ہے قاضی طلحہ بن ہرم کے سامنے ایک درباری کا مقدمہ آیا۔ انھوں نے از روئے قانون بے لاگ فیصلہ کردیا جو درباری کے خلاف پڑا۔ درباری کا تعلق دربار سے تھا۔ وہ آسانی سے قاضی کے سامنے سر اطاعت کیسے خم کرتا۔ اس نے مدینہ کے گورنر خالد بن عبداللہ سے ایک حکم نامہ لکھوالیا جو قاضی کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ قاضی نے صورت حال سلیمان بن عبدالملک کو لکھ کر بھیجی اور اس کام کے لئے محمد بن طلحہ کو قاصد بنایا۔ خلیفہ نے گورنر کے نام حکم نامہ لکھا کہ انصاف میں دخل اندازی نہ کرو۔ محمد بن طلحہ جب خلیفہ کا حکم لے کر گورنر کے پاس پہونچا تو اس نے حکم نامہ پڑھنے سے پہلے قاضی کے فرزند کو سو کوڑے لگوائے۔ قاضی نے اپنے بیٹے کا خون آلود لباس سلیمان کے پاس بھیج دیا۔

(عقد الفرید ج ۲ ص ۲۶)

۹۔ امام ابوحنیفہ کے شاگرد سہل بن مزاحم کو مامون نے خراسان کی گورنری کے زمانہ میں قضا کا عہدہ قبول کرنے کے لئے مجبور کیا۔ انھوں نے انکار کیا جس کے نتیجہ میں جیل بھیج دئے گئے۔

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کی شخصیت ایک ممتاز دینی شخصیت تھی ان کی وفات پر ہارون رشید نے یہ کہا تھا کہ "آج علمار کے سردار کا انتقال ہوگیا"۔ خلیفہ ہارون ان کی زندگی میں ان سے ملاقات

کرنے کے لئے ان کے گھر جانے کی تمنا رکھتا تھا مگر امام غیور ہارون سے ملنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔

۱۱۔ میمون بن مہران حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ سعید میں فوج کے ایک افسر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور جزیرہ میں قاضی بھی رہے تھے پھر محمد بن مروان کے زمانہ میں بیت المال کے سربر دفتر تھے۔ وہ یزید بن عبدالملک کے دور میں مستعفی ہو گئے۔ اور ان کے زندہ ضمیر نے ان سے یہ الفاظ کہلوائے

"میری انگلیاں کٹ جائیں تو یہ مجھ کو زیادہ پسند تھا بہ نسبت اس کے کہ میں کسی عہدہ کا انچارج ہوتا۔"

(غلامانِ اسلام مولانا اکبر آبادی)

۱۲۔ طاؤس بن کیسان مشہور تابعی ہیں اور حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگرد خاص ہیں اپنے عہد کے اربابِ حکومت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ تھا۔

"میں نے ان سے زیادہ کسی کو شر انگیز نہیں دیکھا۔"

وہ ایک مرتبہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کے یہاں گئے تو اس نے خادم کو حکم دیا کہ ان کے کندھوں پر طیلسان (قیمتی کپڑا) ڈالا جائے۔ انھوں نے اس خلعت کو کندھے ہلا کر گرا دیا۔ محمد بن یوسف ناراض ہو گیا اور یہ چلے آئے۔ ایک مرتبہ حاکم یمن نے ۵۰۰ دینار بطور ہدیہ بھیجے مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔

(غلامان اسلام ص ۱۲۸)

۱۳۔ ایوب بن ابی تیمیہ حکام سے نفرت میں یہاں تک پہونچ گئے تھے کہ فرماتے

"مجھ کو میرا بیٹا سب سے زیادہ محبوب ہے مگر اس کے باوجود اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے دفن کر دینا مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہشام یا کوئی اور خلیفہ میرے پاس آئے۔" (غلامان اسلام ص ۱۳۶)

حضرت سفیان ثوری کے حکومت سے عدم تعاون کی وجہ سے سفاح کا ان پر عتاب نازل ہوا۔ پھر تلافی کے لئے اشرفیوں کی تھیلی پیش کی گئی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا۔ خلیفہ مہدی کے زمانہ میں ان کو دربار میں لایا گیا۔ دربار کی طرف سے اصرار ہوا کہ منصب قضا قبول کریں بلکہ فرمان لکھ کر ان کو دے دیا گیا حضرت سفیان ثوری جب دربار سے باہر نکلے تو شاہی فرمان کو دریائے دجلہ میں پھینک دیا اور روپوش ہو گئے۔

۱۴۔ حضرت ربیعۃ الرائی حدیث و فقہ میں امام مالک اور امام ابوحنیفہ دونوں کے استاذ تھے۔ ان کے علم اور تقوی کی وجہ سے ہر جگہ ان کا احترام تھا۔ ابوالعباس سفاح نے عہدہ قضا ان کے

سامنے رکھا مگر انھوں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ انھیں حکومت اور خلیفہ وقت سے شدید نفرت تھی۔ اس نے کوئی قیمتی تحفہ بھجوایا تو اسے واپس کر دیا۔ پھر اس نے پچاس ہزار درہم بھجوائے آپ نے یہ رقم بھی قبول نہیں کی۔

۱۵۔ محمد بن سیرین مشہور تابعی تھے اجل صحابہ کے فیض صحبت سے مشرف ہو چکے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ کے کاتب رہ چکے تھے۔ ان کے معاصرین کا کہنا تھا کہ ان سے بڑھ کر کوئی ماہر قضا نہیں تھا۔ مگر جب عہدۂ قضا ان کے سامنے رکھا گیا تو انکار کر دیا اور مدینہ جاکر مقیم ہو گئے۔

۱۶۔ حضرت عبداللہ بن وہب جنہوں نے امام مالک کی خدمت میں بیس سال گذارے تھے امام ہی کی نگاہ میں فقیہہ مصر قرار پائے لیکن جب خلیفہ نے درخواست کی کہ مصر کا عہدۂ قضا قبول کریں تو روپوش ہو گئے اور عہدہ قبول نہیں کیا۔

۱۷۔ امام محمد بن شیبانی کو قضا پر لانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ انکار کرنے پر قید میں ڈال دیے گئے۔

۱۸۔ امام زفر جو امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے ان کو منصب قضا قبول کرنے کے لئے کہا گیا۔ انھوں نے انکار کیا اور روپوش ہو گئے۔ حکومت نے انتقاماً ان کے گھر کو مسمار کر دیا۔

۱۹۔ ایک بار ہارون رشید اپنی مجلس میں آیا۔ تمام لوگ بادشاہ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اس مجلس میں امام محمد موجود تھے وہ بیٹھے رہے، کھڑے نہیں ہوئے۔ ہارون رشید کو یہ بات ناگوار گذری اس نے اس پر باز پرس کی۔ امام نے جواب دیا کہ آپ نے مجھے اربابِ علم کے زمرہ میں جگہ دی ہے تو مجھے پسند نہیں کہ نوکروں اور خدمت گاروں میں شامل ہوں اور پھر آپ نے یہ حدیث پڑھ کر سنائی کہ جو شخص یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کے اعزاز میں کھڑے ہوں تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔ ہارون رشید کے لئے کلمۂ حق کی تائید کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

۲۰۔ قاضی حفص بن غیاث جنھوں نے بقول ان کے عہدہ قضا اس وقت قبول کر لیا تھا جب مردار کھانا بھی فقر و فاقہ کی وجہ سے حلال ہو گیا ہو۔ عہدۂ قضا قبول تو کیا لیکن حکومت کی بے جا مداخلت برداشت نہیں کی انھوں نے ملکہ زبیدہ کے پاس مقرب خاص کے خلاف عدالت میں فیصلہ دے دیا اور اسے جیل بھجوادیا۔ وہ ملکہ کا نام عدالت میں لیتا رہا لیکن قاضی صاحب نے کوئی پرواہ نہیں کی

قاضی صاحب کے اس جرأت مندانہ فیصلہ کی خبر ملک میں پھیل گئی۔ ملکہ زبیدہ نے اپنے اختیارات سے ملزم کو جیل سے رہا کروادیا۔ قاضی صاحب کو اطلاع ملی تو انھوں نے کہا کہ زبیدہ کا پارسی مقرب خاص کو جیل میں بھیج دیا جائے یا پھر آئندہ عدالت کا اجلاس نہیں کروں گا۔ چنانچہ ملزم کو دوبارہ جیل بھجوایا گیا۔ ملکہ زبیدہ پارہ چڑھ گیا اس نے ہارون رشید سے کہا کہ "اب نہ میں تمھاری اور نہ تم میرے جب تک کہ قاضی کو منصب قضا سے الگ نہ کر دیا جائے"۔ چنانچہ قاضی کا کوفہ میں تبادلہ کر دیا گیا۔

۲۱۔ خلیفہ منصور کے زمانہ میں قاضی شریک پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ عہدۂ قضا قبول کرلیں انھوں نے اس شرط کے ساتھ عہدہ قبول کیا کہ انھیں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ خلیفہ یا دربار کی طرف سے ان کے کاموں میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

پہلے ہی مقدمہ میں خلیفہ کی ایک چہیتی لونڈی پیش ہوتی ہے اور اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کے نشہ میں فریق مخالف کے برابر بیٹھنے کے بجائے قاضی صاحب کی کرسی کے برابر جاکر بیٹھتی ہے قاضی صاحب اس کی اس حرکت پر اسے ڈانٹتے ہیں اور جواب میں وہ برسر عدالت قاضی کو برا بھلا کہتی ہے اور بالآخر اپنے اثرات استعمال کرکے وہ قاضی کو معزول کرا دیتی ہے۔ یہ وہ "اسلامی حکومت" تھی جس کے فرماں روا کی ایک معمولی لونڈی قاضی سلطنت کو نکلوا کر چھوڑتی ہے۔

۲۲۔ امام ابو یوسف نے عدالت کے اجلاس میں برسر عام خلیفہ کے وزیر کو مردود الشہادہ قرار دے دیا۔ کسی مقدمہ میں وزیر کی گواہی تھی قاضی ابو یوسف نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ تمھاری گواہی قابل قبول نہیں ہے وزیر مملکت نے اس توہین کے خلاف خلیفہ سے جاکر شکایت کی، خلیفہ نے دریافت کیا کہ آپ نے اسے مردود الشہادۃ کیوں قرار دیا تھا۔ امام ابو یوسف نے جواب دیا کہ میں نے خود اپنے کانوں اس کا یہ قول سنا ہے کہ "میں خلیفہ کا بندہ (عبد) ہوں نیز ہر شخص جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا"۔ یہ جواب سن کر ہارون خاموش ہوگیا۔

(امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۳۶۱)

اسلام نے جہاد و احتساب کی جو روح اپنے ماننے والوں میں پھونکی تھی وہ پوری تاریخ میں باقی رہی۔ یہ چند نمونے تھے جو پیش کئے گئے۔ ابن قتیبہ کی عیون الاخبار اور امام غزالی کی احیاء العلوم اور دیگر کتابوں میں اس طرح کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص ان ہی واقعات کو جمع کرے

تو ایک پوری کتاب تیار کی جا سکتی ہے ۔ ائمہ دین حنیف اور مجاہدین اسلام نے اپنے خونِ جگر سے چمن اسلام کی آبیاری کی ہے اور انھیں یہ کہنے کا حق ہے کہ:

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

یہ بات اہلِ نظر کو معلوم ہے کہ اجتماعی اور سیاسی جد وجہد فرض عین نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر مسلمان کے لئے اپنے کو فارغ کرنا لازمی ہو۔ یہ کام فرض کفایہ ہے ۔ اگر ایک گروہ اس کام کو انجام دے رہا ہے تو وہ پوری ملت کی طرف سے انجام دے رہا ہے ۔ کبھی کسی اور علمی اور دینی خدمت میں انہماک بھی اس طرح کی اجتماعی جد وجہد میں شریک ہونے میں حائل ہو سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ مزاحمت واحد طریقہ کار نہیں ہے ، حسب ضرورت اصلاح کے دوسرے طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد علماء مزاحمت اور مقابلے سے کنارہ کش رہے اور دوسری خدمات انجام دیتے رہے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ۔ اعتراض کی بات اس وقت ہوتی ہے جب حکومت کی اصلاح کی کوششوں کو مطعون کیا جائے اور ان ائمہ عظام کی تحقیر کی جائے جنھوں نے اسلام کے نظام حکومت و سیاست کی چول درست کرنے کے لئے جان و مال کی قربانیاں دیں ۔

باب سوم

فہمِ دین کی راہ کی دشواریاں اور توازن کی تلاش
اور
دورِ جدید میں اسلامی کوششیں

صحیح تصور دین یا دین و سیاست کے رشتہ کے متوازن تصور کے ادراک میں جو مشکل پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں مختلف ادارے خدمت اسلام کے عنوان پر متحرک ہیں۔ تزکیہ نفس اور روحانیت کے مرکز بھی ہیں، اسلامی علوم کی تعلیم واشاعت کے لئے مدرسے بھی قائم ہیں، دینی کتابوں کی اشاعت کا کام بھی انجام دیا جارہا ہے اور تحقیقی کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ اسلام پر اعتراضات کے جواب بھی لکھے جارہے ہیں فقہ اکیڈمی بھی قائم ہے، اقامت دین کی تحریک بھی ہے، دنیا میں کہیں جہاد بھی ہورہا ہے، کہیں اہل دین سیاست میں سرگرم ہیں کہیں خدا سے رشتہ جوڑنے اور عبادات میں دل لگانے کی تبلیغ بھی ہورہی ہے۔ ایک عام انسان ہی نہیں بلکہ متوسط درجہ کے پڑھے لکھے انسان کو بھی یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ وہ خدمت دین کے جس کام کو جس ادارہ کے ساتھ وابستہ ہوکر انجام دے رہا ہے وہی حقیقی دین ہے باقی سب غیر حقیقی۔ وہ اپنے طریقہ کے علاوہ تمام طریقوں کی نفی کرنے کے لئے تیار ہوجائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان دین کی مختلف شکلوں اور باہمی اختلافات کو دیکھ کر دین کو ایک ایسا خواب پریشاں سمجھ لے جس کی بے شمار تعبیریں ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک پہلو پر ترکیز میں ایسا غلو پیدا ہوجائے کہ انسان دوسرے پہلوؤں کا انکار کر بیٹھے۔

فکر و نظر کی حیرانی اور سرگشتگی کی وجہ یہ ہے کہ انسانی نظر جو کچھ اور جتنا کچھ دیکھتی ہے اسی پر اپنے اپنے فہم کی بنیاد رکھتی ہے۔ اندھوں کے ہاتھ ہاتھی کے ہیکل جسمانی کے جس حصہ پر پڑے تھے صرف اسی حصہ کو انھوں نے ہاتھی سمجھ لیا تھا۔ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ مطالعہ اور مشاہدہ کو وسیع کیا جائے اور ائمہ سلف کی متفقہ تشریحات سے انحراف کی بات سوچی بھی نہ جائے اس لئے کہ دین ان ہی کے ذریعہ اور ان ہی کے واسطے

سے پہونچا ہے۔ یہ مطالعہ کی وسعت ہی ہے جو انسان کو اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ انسان کی حیثیت خلیفہ کی ہے نباتات وجمادات وحیوانات پر تصرف وحکمرانی اس کا حق اور اس کے منصب کا تقاضہ ہے بحر وبر، خیمہ افلاک، نور آفتاب سب اس کی سپاہ اور اس کی خادم ہیں۔ اسی کے ساتھ عبادت انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ خدا کی محبت اور اس کا خوف جب دل میں اپنا مسکن اور نشیمن بنالیتا ہے تو انسان کا سجدہ سجدہ قربت (واسجد واقترب) بن جاتا ہے۔ یہ عبادت کا انفرادی اور داخلی تقاضہ ہے۔ احکم الحاکمین اور واضع القوانین ذات خداوندی کا استحضار بندہ مومن کو سیاسی اور اجتماعی کاموں میں بھی سرگرم رکھتا ہے۔ یہ عبادت کا اجتماعی اور خارجی تقاضہ ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ایک فرد یا ایک جماعت ذاتی یا ملکی حالات کے تحت دین کے پورے نظام کے لئے سرگرم نہ ہو بلکہ اس کے کسی ایک جز دیا اس کے احیار کو اپنا مقصد بنائے۔ ایسا کرنا بالکل جائز اور درست ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ دین کے مکمل نظام اور دستور ہونے کا تصور ذہن سے محو نہ ہو اور چند اجزاء ہی کو کل دین سمجھنے کی غلطی سے بچا جائے اور جو لوگ دین کے دوسرے محاذوں پر سرگرم ہیں ان کی ناقدری یا مخالفت سے گریز کیا جائے۔ یہ اس لئے کہ دین کی حیثیت ایک باغ کی ہے جس میں چھوٹے اور بڑے درخت شاخیں اور پتے پھل اور پھول سبھی کچھ ہیں بلکہ پھولوں کی حفاظت کے لئے کانٹے بھی باغ کے اندر داخل ہیں۔ یہ انسان کا نقص فہم وادراک ہے کہ وہ سبد گل کو یا شاخ پر میوہ کو کل باغ سمجھ لے۔

قرن اول کے مسلمانوں نے منشأ قرآن کو پورے طور پر سمجھا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچکر مسلم معاشرہ کی تنظیم کی۔ اسلامی حکومت کے دفاع کے انتظامات کئے۔ اقتصاد اور معیشت کے اصول سکھائے۔ بدر کے جو قیدی ہاتھ آئے ان کو تعلیم پر مقرر کیا۔ الغرض تعلیم اور تربیت، اقتصاد ومعیشت، سیاست وحکومت، جہاد اور دفاع، تبلیغ ودعوت تمام پہلوؤں پر آپ نے توجہ فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی زندگی کا آئیڈیل کیا ہونا چاہیے اور اس کے فکر ونظر میں کتنا توسع ہونا چاہیے خود قرآنی آیات کے تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنانہ ذہن کو ہمہ جہت ہونا چاہیے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کامل ایمان اور کامل دینداری تمام اوقات کو ذکر ونوافل میں مصروف رکھنے کا نام ہے اور انجنیر بننے اور ٹکنولوجی میں مہارت حاصل کرنے اور دنیاوی علوم وفنون میں لگنے کا نام صرف دنیاداری ہے انہوں نے نہ تو دین کو سمجھا ہے نہ قرآن میں تدبر کیا ہے۔ بہت سے واعظ وخطیب

مسلمانوں میں ملیں گے جو اپنی تقریروں میں بتائیں گے کہ دنیا کی قدیم قومیں صنعت و حرفت، تجارت و زراعت کے باوجود ناکام ہوگئیں اور اللہ نے ان پر عذاب بھیجا۔ وہ اپنی تقریروں سے یہ ذہن بناتے ہیں کہ سارے کام عبث ہیں اور اللہ کے نزدیک غیر مطلوب ہیں۔ بلاشبہ یہ سارا علم صفت ایمان کے بغیر غیر مقبول ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اہل ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اور اہل دنیا کی بھلائی کے لئے اور رفاہ عامہ کے لئے صنعت و حرفت میں اور جدید علوم میں مہارت حاصل کریں۔ دنیا اہل ایمان کے لئے بنائی گئی تھی، فطرت کی طاقتیں اس کے لئے مسخر کردی گئیں تھیں تاکہ وہ جہاد اور اجتہاد، تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اور جدید وسائل سے مسلح ہوکر اللہ کی عبادت و اطاعت کا تمام اہل دنیا تک پیغام پہنچائیں۔ قرآن میں ذوالقرنین کا تذکرہ ہے جنہوں نے مضبوط دیواریں بنائی تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ ہے جن کے لئے لوہا نرم کردیا گیا تھا۔ قرآن میں مسلمانوں کو سامان جنگ کی تیاری کا واضح اور صریح حکم دیا گیا ہے۔ دین کے متوازن تصور تک پہنچنے کے لئے ان تمام باتوں کا خیال ضروری ہے۔

دورِ جدید کی چند اسلامی کوششیں :

اس مقام پر تلبیس ابلیس سے بھی بہت سے ذہین لوگوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔ ابلیس ان کے ذہن میں یہ القا کرتا ہے کہ دین ایمان اور چند عبادات کا نام ہے جن کی کچھ ظاہری شکلیں ہیں باقی چیزیں حالات کے لحاظ سے مطلوب ہوتی ہیں۔ ان کے ذہن سے یہ نکتہ محو ہوجاتا ہے کہ جب دین اپنے پورے نظام کے ساتھ ظہور پذیر نہیں ہوتا تو اس کے ثمرات و برکات بھی ظاہر نہیں ہو پاتے ہیں اس لئے دین کو دنیا میں غلبہ کے مقام تک پہنچانے کی کوشش بھی ضروری ہے۔ یہ کوشش کہیں برسر اقتدار گروہ سے بات چیت کی شکل میں نظر آسکتی ہے اور جب مفاہمت اور پرامن ذرائع بالکل مسدود کردیئے جائیں تو ٹکراؤ کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے۔ کہیں سیاسی حکومیت کو ختم کرنے اور آزادی کی تحریک کی صورت میں نظر آسکتی ہے۔ کہیں مسلمانوں کو جدید سائنس اور ٹکنولوجی سے آراستہ کرنے کی جدوجہد میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ کہیں اسلام پر فکری اور

نظریاتی اعتراضات کی دفاعی کوششوں اور جدید علم کلام کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ تجدید دین اور غلبۂ اسلام کی کوششوں کے ہزار رنگ اور ہزار نام ہو سکتے ہیں زمان ومکان کے فرق کے ساتھ اس کا طریقہ کار بدلتا رہتا ہے۔

ماضی قریب میں عرب دنیا میں جمال الدین افغانی، محمد رشید رضا کی تحریکیں اور حسن البنا شہید کی تحریک الاخوان المسلمون ترکی میں سعید نورسی اور افریقہ میں عبدالقادر الجزائری اور شیخ سنوسی کی تحریک سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریک ہندوستان میں سید احمد شہیدؒ اور اسماعیل شہیدؒ کی دعوت جہاد بنگال میں حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اس کے بعد حالی شبلی؟ ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال کی فکری ادبی اور سیاسی محاذوں پر کوششیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے اصلاحی رسالے یہ سارے کام اور یہ ساری جد وجہد تجدید دین کے دائرہ کار میں داخل ہیں۔ ان ساری کوششوں کا محرک دینی جذبہ ہے۔ ہندوستان میں اقتدار اگرچہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا لیکن مسلمانوں کو اخلاقی فکری تعلیمی اور معاشی اعتبار سے مستحکم بنانے کی کوششیں جاری ہیں اور ان کے اچھے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔

زمانہ حال کی تحریکات

ہندوستان میں آزادی کے بعد جو دینی کوششیں کی گئی ہیں اور ملت اسلامیہ کی دینی اور تہذیبی حفاظت کے جو ادارے سرگرم ہیں ان میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا نام نمایاں ہے۔ اس بورڈ نے عائلی قوانین کی حفاظت کے ساتھ اصلاح معاشرہ کی تحریک بھی شروع کی ہے جو بہت ضروری اور مفید ہے۔ تمام مسلم جماعتیں اور تنظیمیں اس میں شریک ہیں اس طرح مسلم پرسنل لا بورڈ اتحاد ملت کی علامت بھی بن گیا ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کو ان کے تشخص سے محروم کرنے اور اسلامی قانون کی مخالفت کی سازش اور کوشش جاری ہے۔ یہ بورڈ اس کوشش کی راہ میں ایک رکاوٹ بن کر حائل ہو گیا ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے وجود میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی تہذیبی حفاظت اور دوسری

خدمات میں جمعیۃ علماء ہند کا نام بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت ملت اسلامیہ کا جسم لہولہان، دل مضطرب اور مستقبل مشکوک تھا۔ اس وقت ان کی دادرسی اور اعتماد آفرینی کے لئے جمعیۃ علماء ہند میدان میں آئی تھی۔ جمعیۃ کے کارناموں میں ایک اہم بالشان کارنامہ امارت شرعیہ کا قیام ہے جو بہار و اڑیسہ میں سرگرم اور مثالی ہے۔

ہندوستان کے عربی مدارس ہندوستان میں دین کے قلعے ہیں۔ یہاں کے تربیت یافتہ مجاہدین دین نے مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ آزاد ہندوستان میں مختلف و متعدد جماعتیں مسلمانوں کی دینی اور ملی حفاظت کے لئے سرگرم رہی ہیں۔ ان جماعتوں کی قیادت ان ہی مدارس کے فضلاء نے کی ہے۔ ان مدارس میں ہمہ وقت قال اللہ اور قال الرسول کا زمزمہ دل کو یقین کی اور دماغ کو علم کی روشنی بخشتا ہے۔ مدارس کے فضلاء نے پورے ملک میں چھوٹے چھوٹے مدرسوں کا جال بچھا دیا ہے۔ یہ درویش صفت اور بوریہ نشیں علما جو سرمایہ کی کمی کی وجہ سے تمدن کی جدید سہولتوں سے محروم ہیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہیں۔

مقابلہ کی نئی دنیا میں عزت و منصب حاصل کرنے کے لئے جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونا بھی ضروری ہے۔ اس میدان میں مسلمانوں کو جگانے اور ان کو ان کا جائز مقام دلانے کی تحریک بھی اٹھی ہے وہ کام جو گزشتہ صدی میں سرسید نے انجام دیا تھا اب بدلے ہوئے حالات میں نئے طریقے سے اس تحریک کو چلانے کی ضرورت تھی۔ تعلیم آباد کا قیام ہمدرد اسکول کا قیام اور تعلیمی کارواں نے افق پر سعی و عمل کا نشان ہے۔ جنوبی ہندوستان کے مسلمان تعلیم اور معیشت کے میدانوں میں پہلے سے مفید کام انجام دے رہے ہیں۔

روایتی انداز سے ہٹ کر اسلامی موضوعات سے ہم وطنوں کو روشناس کرنے کی وقیع کوششیں شروع ہوئی ہیں: اہم اور زندہ عنوانات پر جو اخبارات میں بحث کا موضوع بنے رہتے ہیں کئی سیمینار منعقد کئے گئے ہیں جس میں غیر مسلموں کو بھی گفتگو کے لئے بلایا جاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی کے لئے مسلمانوں کے کسی باصلاحیت فرد کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جدید دانش گاہوں کے سماجی علوم کے مسلم اساتذہ جو ایک ممکنہ طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں انکی صلاحیتوں

کو ایک تعمیری رخ دیا گیا ہے۔ یہ سب کام انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نے انجام دیئے ہیں۔ اس ایک ادارہ نے اور بھی کئی مفید ادارے قائم کردیئے ہیں جن میں فقہ اکیڈمی، فاؤنڈیشن ایجنسی اور یونیورسل پیس فاؤنڈیشن کا نام زیادہ نمایاں ہے۔ مختلف علوم وفنون کی اسلامی نقطۂ نظر سے تدوین نو کا کام بھی اس ادارہ کی خدمات کے دائرہ میں داخل ہے۔ یہ ادارہ مسلمان طلبہ کو تعلیمی وظائف بھی دیتا ہے۔ گذشتہ دس سال میں اس ادارہ نے نمایاں کام انجام دیئے ہیں اور مفید کتابیں شائع کی ہیں۔

غلط افکار ونظریات کی تردید، سائنس اور تمدن کی ترقیوں کو اپنے ہاتھ میں لینا۔ نوامیس فطرت سے آگہی، عقل کی خوابیدہ قوتوں کو جگانا اور جدید قوتوں کو اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کے لئے استعمال کرنا اور نئے سرے سے مسلمانوں کو ایک عالمی طاقت بنانا یہ سارے کام دین میں اہم مقام رکھتے ہیں اور مسلمانوں نے عالمی سطح پر ان میدانوں میں پیش رفت کی ہے۔ جہاد افغانستان کے نتیجہ میں مشرقی یورپ کی قومیں آزاد ہوئی ہیں۔ روس ایک عالمی قوت کے مقام سے گر کر مغربی ملکوں کا مقروض اور دست نگر بن گیا۔ وسط ایشیا کی مسلمان ریاستیں آزاد ہوگئیں۔ اشتراکیت اب ماضی کی داستان بننے والی ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ اور انکو طاقت اور عزت کا مقام دلانے کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان میں آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (O I C) اسلامی ترقیاتی بینک، اسلامی چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹریز، بین الاقوامی اسلامی جامعات، اسلامی بینکوں کا عالمی اتحاد، بلا سود بینک جس کا کل اثاثہ ۸۰ بلین ڈالر سے متجاوز ہے اور رابطہ عالم اسلامی وغیرہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔ اگر قرآن وسنت پر اور سیرت طیبہ پر انسان کی نظر ہو تو اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کے رفاہ اور ان کو طاقت وعزت اور قیادت کے مقام تک پہنچانے کی ساری کوششیں دینی ہوں گی اور اگر یہ بصیرت حاصل نہیں ہے تو پھر وہ جس خول میں بند ہوگا اس سے باہر کوئی کام اسے دینی کام نظر نہیں آئے گا۔

عدم توازن کی مثال

دین کے متوازن تصور کو سمجھ لینا اور پھر اس روشنی میں اہل قلم اور مفکرین کی تحریروں کا اور جماعتوں کے مزاج کا مطالعہ کرنا ایک مفید اور ضروری کام ہے۔ مقصود اس کام کا یہ ہونا

چاہیے کہ دین کا اصل تصور ذہنوں میں جاگزیں ہو اور امت افراط و تفریط کا شکار نہ ہونے پائے۔
اب ایک مثال ہمارے سامنے ایک مدیر رسالہ کی ہے جو صاحب فکر بھی ہیں اور صاحب قلم بھی اور صاحب مطالعہ بھی لیکن متوازن نہیں۔ انہوں نے الحاد اور دہریت کے مقابلہ کے لئے چند اچھی کتابیں لکھی ہیں جو بجا طور پر قابل ستائش ہیں لیکن تصور دین کے سلسلے میں ان کے یہاں لائق مؤاخذہ حد تک عدم توازن پایا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قلم سے جو دین کی تشریحات نکلیں ان میں بھی عدم توازن تھا اور ملت کے مسائل پر جو کچھ انہوں نے خامہ فرسائی کی اس میں بھی حق اور باطل کی آمیزش ہو گئی مثال کے طور پر وہ مسلمانوں کو صبر کرنے اور تعمیری کاموں میں مشغول رہنے کا درس دیتے دیتے انتہا پسندی کا شکار ہو گئے۔ ان کی تحریروں سے مقدس جہاد اور شہادت کا استخفاف ٹپکتا ہے۔ ابن تیمیہؒ نے تاتاریوں کے خلاف جہاد کیا تھا یہ بھی ان کے لئے موضوع تنقید تھا۔ افغانستان کے جہاد کی بھی انہوں نے مذمت کی۔ اور یہ لکھا کہ افغانیوں کو چاہئے تھا کہ انگریزوں کو اپنے یہاں حکومت کی دعوت دیتے تاکہ وہ انگریزی زبان اور جدید تعلیم سے آراستہ ہوں۔ تلوار اور جہاد کے خلاف ان کے مشن کو دیکھتے ہوئے اقبال کی ایک نظم یاد آ ئی ہے جو اسی قسم کے ایک شیخ صاحب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر
تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی

دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے !
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر؟

جہاد اسلام کا مہتم بالشان رکن ہے۔ دین و سیاست کے رشتہ کو جاننے کے لئے جہاد اور اس کے احکام کا مطالعہ بھی کافی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص دنیا سے رخصت ہو گیا اس نے اپنی زندگی میں جہاد کیا اور نہ کبھی جہاد کی آرزو اس کے دل میں پیدا ہوئی اس کی موت گویا منافق کی موت ہوئی (صحیح مسلم) اسی طرح آپ نے فرمایا ہے کہ جہاد میں صبح یا شام کا چلنا دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ اب اگر کوئی شخص جہاد کی اہمیت گھٹاتا ہے یا دورِ شمشیر کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہے اور اسلام کے مکمل نظام ہونے کا انکار کرتا ہے اور دین و سیاست میں تفریق کا قائل ہے تو وہ تحریفِ دین کا مرتکب ہے۔ وہ ایک کلیسائی تصورِ دین کو لے کر اٹھا ہے اس کا مشن یہ ہے کہ مسلمانوں کو دستوری اور قانونی جدوجہد سے بھی روک دیا جائے اور یہ کہ ساری دنیا میں مسلمان کشمکش و کشاکش کے کردار سے بیگانہ ہو کر زندگی بسر کریں۔ اس کا پیغام اپنے مریدین کے نام یہ ہے ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

جماعت اسلامی

عدم توازن کی مذکورہ نمایاں مثال کے بعد توازن کی تلاش میں ہمارے سامنے جماعت اسلامی آتی ہے۔ اس جماعت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملت کو فکر انگیز لٹریچر فراہم کیا ہے چوں کہ آسمانی کتاب قرآن مجید خود بلاغت و معانی کا معجزہ ہے اور سورۂ رحمٰن میں تخلیق انسان کے بعد تعلیم بیان کو اللہ نے اپنی بڑی نعمت قرار دیا ہے (خلق الانسان علمہ البیان) اسی لئے ملت اسلامیہ کے مجموعی مزاج میں شگفتگیٔ تحریر کو ایک لازمی عنصر کے

طور پر شامل ہونا چاہئے۔ اولین وحی اقرأ سے شروع ہوئی تھی اور اس میں چند آیتوں کے بعد قلم کا نام آتا تھا۔ یہ ساری باتیں اس بات کا اشارہ کر رہی تھیں کہ پریس کا اور لٹریچر کے دور کا آغاز ہونے والا ہے اس لئے اس امت کو بھی قلم و کتاب کے ہتھیار سے آراستہ ہونا چاہئے اگر جماعت اسلامی نے کتاب اور قلم کو اصلاح و دعوت کا ذریعہ بنایا تو یہ قرآن و سنت کے روح کے عین مطابق تھا اور گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ مصلحین امت نے علم اور قلم سے کام لینے میں پہلوتہی نہیں کی۔

جماعت اسلامی اور خاص طور پر اس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے وقت کے اسلوب میں اسلام کی ترجمانی اور اس کے دفاع کا لٹریچر تیار کیا۔ اشتراکیت کے عروج کے زمانہ میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اشتراکیت کے اثرات سے بچانے اور اسلام پر جمانے میں اس لٹریچر نے اہم رول ادا کیا۔ اس کی بدولت اسلام کے نظام حیات سے عقلی اور فکری وابستگی پیدا ہوئی۔ یہ لٹریچر اتنا طاقتور تھا کہ عرب اور اسلامی ملکوں تک اس کی بازگشت محسوس کی گئی اور اس نے مختلف اسلامی تحریکات کے لئے ہراول دستہ کا کام کیا اور ایک انقلاب پیدا کیا۔ غیر مسلموں میں کام کرنے کا میدان خالی تھا۔ قرآن مجید کے مختلف مقامی زبانوں میں ترجمے شائع کئے اسلام پر کتابیں ہندی اور علاقائی زبانوں میں شائع کیں۔ یہ جماعت مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی کوششوں میں شریک رہی اور افتراق کے راستوں سے احتراز کیا۔

سقوط خلافت عثمانیہ کے بعد جب مسلمانوں کی نہ صرف شوکت و حشمت کا خاتمہ ہوا بلکہ قومیت اور لادینیت اور تفریق دین و سیاست کی تحریکوں نے مسلمانوں میں فکری انتشار برپا کیا تھا۔ اس وقت اسلام کے صحیح خدو خال کے پیش کرنے میں جماعت کے لٹریچر نے اہم کردار ادا کیا تھا، اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو جماعت اسلامی کی نظریاتی بنیاد آیت خلافت پر رکھی گئی ہے اس کے مکتب فکر کا سرچشمہ آیت عبادت سے زیادہ آیت خلافت ہے اس لئے خدمت اسلام کے میدان میں نمایاں کارکردگی اور جامع تصور دین کے باوجود بعض اہل نظر کو یہ احساس ہوا کہ بانی جماعت کی تحریروں میں ناہمواریاں بھی ہیں اور اس کے فکری نظام میں دین کا تعبدی پہلو کمزور ہے خود جماعت کے ذمہ داروں کو بھی غالباً اس کا احساس تھا بعد میں تصوف کی کتاب

کشف المحجوب کا اردو ترجمہ اور اذکار و ادعیہ کی کتابوں کی اشاعت ہو سکتا ہے کہ اسی احساس کے تحت اس تعبدی پہلو کو صحیح مقام دینے کی ایک کوشش ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی بیشتر اہم زبانوں میں جماعت اسلامی کی اہم کتابوں کی اشاعت کے بعد یہ تحریک ایک بین الاقوامی فکری تحریک بن گئی ہے۔ آج دنیا میں اسلامی بنکوں کا جو نظام قائم ہو رہا ہے اور غیر سودی سرمایہ کاری کی جو تحریک چل رہی ہے۔ ہر جگہ اسلامی بیداری اور شریعت کے قوانین کے نفاذ کی جو کوششیں ہو رہی ہیں جو کہیں کہیں ٹکراؤ کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں ان سب کے پشت پر جماعت اسلامی کا لٹریچر بھی ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔

خانقاہیں اور خانقاہوں کے مخالفین

توازن کی تلاش میں کبھی نظر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی خانقاہوں پر پڑتی ہے۔ دیہات و قصبات اور دور دراز کے شہروں میں کوئی خانقاہ یا کوئی درگاہ ضرور مل جائے گی۔ اس ملک میں لاکھوں لوگ کسی پیر طریقت سے بیعت ہیں۔ ان خانقاہوں یا درگاہوں کی حیثیت دینی مرکزوں کی ہے اور مسلمانوں کا روحانی اور تربیتی نظام ان سے وابستہ ہے لیکن ان کی افادیت دراصل پیر طریقت کی صلاح اور صلاحیت پر منحصر ہے۔ پیر اگر روشن ضمیر ہے تو لوگوں کو سچ مچ بہت فائدہ ہوتا ہے اور ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کی زندگیاں سنور جاتی ہیں اور اگر ناقص اور غیر تربیت یافتہ ہے تو ان کی زندگیاں غلط نمونہ کی وجہ سے برباد ہو جاتی ہیں۔ اس ملک میں لاکھوں افراد نے ماضی میں روحانیت کے مرکزوں کے ذریعہ اسلام قبول کیا ہے لیکن اب زیادہ تر مرکزوں میں ایمان و یقین کی حرارت کے بجائے ایک روایتی دین باقی رہ گیا ہے جہاں لوگوں نے کسب معاش کی دکانیں کھول دی ہیں اور صرف رسم و رواج کی پیروی باقی رہ گئی ہے اور رسم و رواج کے ہجوم میں صحیح دینی تصورات کھو گئے ہیں۔

یہاں دین کے تصور میں عدم توازن پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ ان کتابوں کو بھی معیار بنایا جاتا ہے جن کے بارے میں اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری

موضوع احادیث اور خاندانی رسوم و رواج کو بھی استناد کا درجہ مل گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ

حقیقت روایات میں کھو گئی

یہ امت خرافات میں کھو گئی

اگر یہ خانقاہیں ایمان ویقین کا پاور ہاؤس بن جائیں جس سے یقین کی حرارت اور ذات رسالت سے عشق ومحبت کی بجلی تقسیم ہونے لگے اور ذکرالہٰی سے سینے معمور ہو جائیں تو آج بھی پورے ملک میں ان خانقاہوں سے انقلاب آسکتا ہے۔

لیکن صوفیا اور خانقاہی اشخاص میں عدم توازن دوسری شکلوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور یہ کہ غیر شعوری طور پر یہ تصور جاگزیں ہو جاتا ہے کہ دین کا تعلق کچھ عبادات اور کچھ معمولات سے ہے اگر یہ معمولات پورے کر لئے جائیں اور سالانہ رسومات میں شرکت ہوتی رہے تو پھر انسان دیندار ہے خواہ معاشرہ اور تہذیب کچھ بھی اختیار کرلے چنانچہ بہت سے مشائخ کے گھروں میں شادی کی تقریبات میں مسرفانہ رنگ دیکھا گیا۔ بارات کی دھوم دھام جہیز کے سامانوں کی نمائش، رات بھر جاگنا اور صبح کی نماز قضا کرنا، گھر کے افراد کا ویڈیو فلمیں دیکھنا اور لہو ولعب میں مشغول ہونا، اہل فسق کی تمام باتیں ان کے گھروں میں پائی جاتی ہیں حالانکہ ٹیلیویژن (پروگرام کے بڑے حصہ کے اعتبار سے) وہ چیز ہے جسے قرآن میں "لھوا لحدیث"، قرار دیا گیا ہے

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

امام راغب اصفہانی نے "لھو" کی تفسیر "مایشتغل الانسان عمّا یعنیہ" سے کی ہے یعنی وہ چیزیں جو انسان کو لائق اہتمام چیزوں سے غافل کردیں۔

ایک اور مثال اس گروہ کی ہے جو ملک میں پھیلی ہوئی قبر پرستی اور بدعات کے خلاف کھڑا ہوا اس نے قرآن وحدیث کی روشنی میں دین کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ عرس، چادر پوشی، نیاز فاتحہ، قل اور قوالی چہارم اور چہلم کی رسموں کو انجام دینے والوں کیلئے "بدعتی"، کا لفظ بطور گالی استعمال کیا۔ اس کے جواب میں مذکورہ گروہ کے لوگوں کو "وہابی"، کہا گیا۔

اس حرب عقائد کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجدیں الگ ہوگئیں، کفر کے فتوے دیئے گئے۔ مقدمہ بازیاں ہوئیں اور معاملہ بالجہر سب و شتم سے بڑھ کر "رفع یدین" تک جا پہنچا اور شاعر کو کہنا پڑا۔

دین ملاّ فی سبیل اللہ فساد

ان نزاعات باہمی کا تجزیہ کر کے دیکھئے جن میں غیر مسلم عدالتوں کو مداخلت کرنی پڑی اور امن و قانون کا مسئلہ پیدا ہوا تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے دینی تصور میں "جَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ" کا خلا پیدا ہوگیا ہے اور اشداء علی الکفار اور رحماء بینہم یعنی حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد ہونے کی صفت مفقود ہوگئی بلکہ ٹھیک اس کی برعکس صفت ان میں پیدا ہوگئی ہے حالانکہ مسلمانوں کو اختلاف فکر کے باوجود ایک دوسرے کے لئے مددگار اور مہربان ہو کر رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اتحاد کا حکم منصوص ہے اور مسلمانوں کو جسم واحد سے تشبیہ دی گئی کہ ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم بخار سے جلنے لگتا ہے اور آرام کی نیند ختم ہو جاتی ہے۔ باہمی اتحاد و اعتماد کی اس سے بڑھ کر کوئی اور تشبیہ نہیں ہو سکتی۔

تبلیغی جماعت

ہندوستان میں تبلیغی جماعت کی مثال ہمارے سامنے ہے آج دنیا میں کون ہے جو تبلیغی جماعت کے نام اور کام سے واقف نہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ، کو بہ کو تبلیغی جماعت کے قافلے پیدل اور سواریوں پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زبان پر ذکر، آنکھوں میں شب بیداری کے آثار، پیشانیوں پر سجدے کے نشان، لباس گرد آلود، رخت سفر مختصر بر دوش، تسبیح بدست، جدید تمدن کی خوش جمالیوں سے دور، دور سے دیکھ کر لوگ ان کو پہچان لیتے ہیں۔ عام لوگوں سے مختلف، یقین و ایمان کی دنیا کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔

یہ تیری گلیوں میں پھر رہے ہیں جو چاک داماں سے لوگ ساقی
کریں گے تاریخ مے مرتب یہی پریشاں سے لوگ ساقی

لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ، جلو میں صد انقلاب رقصاں
نہ جانے آتے ہیں کس جہاں سے یہ حشر داماں سے لوگ ساقی

تبلیغ کا یہ کام جو نظام الدین دہلی کے تبلیغی مرکز کے زیر سرکردگی شروع ہوا تھا وہ ساری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں اس کی بدولت انقلاب آیا ہے۔ خود نہ تھے جو راہ پر وہ اوروں کے رہبر بن گئے۔ بہت سے جدید علم و ثقافت کے لوگوں میں ایسی زبردست تبدیلیاں آئیں کہ وہ دیکھنے میں مولوی اور عالم معلوم ہونے لگے۔ ان سب کے ساتھ تواضع اور علم دین کا اور علماء کا احترام ان کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کی اپنے پھیلاؤ اور اثر انگیزی کے اعتبار سے سب سے بڑی دینی تحریک ہے اس کے باوجود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا یہ بیان ان کی دینی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

"جماعت کے قابل قدر اثرات و نتائج کا اعتراف کرتے ہوئے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانہ کی تبدیلی، نئے خطرات اور چیلنجوں اور نئی سازشوں اور منصوبوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو تاریخ کے ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کو کم و بیش پیش آتے ہیں اور اس زمانہ میں وہ کہیں زیادہ سنگین مہیب اور عمیق اور دور رس ہیں جماعت کے اصولوں اور بنیادی ہدایات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔"

تبلیغی جماعت کے اثرات دنیا کے اکثر ملکوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر گہرائی کے ساتھ اس کے مزاج کا جائزہ لیا جائے تو اسے ایک انقلابی نوعیت کی خانقاہ کہنا مناسب ہوگا۔ تزکیہ باطن، تصفیہ قلب، سوز یقین، شوق ذکر و عبادت، ذوق دعا و مناجات تبلیغی جماعت کی امتیازی صفت ہے اور یہی خصوصیات خانقاہوں کی بھی رہی ہیں۔ پہلے لوگوں میں دین کی طلب ہوا کرتی تھی وہ دور دراز کا سفر کر کے خانقاہوں اور روحانی مرکزوں تک پہنچتے تھے اور اپنے دل کی سرد انگیٹھیوں کو گرم کرتے تھے۔ مولانا الیاسؒ نے دیکھا کہ اب وہ طلب و جستجو نہیں باقی رہی تو انہوں نے متحرک اور سرگرم سفر خانقاہوں کا نظام قائم کر دیا۔ یہی نظام ہے جسے لوگ

تبلیغی جماعت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لوگ اپنا وقت فارغ کرکے شریک قافلہ ہوتے ہیں اور دین کی بنیادی باتیں سیکھتے ہیں اور ذکر و عبادت کا اہتمام کرتے ہیں۔

اس جماعت کے کاموں کا ایک مخصوص دائرہ ہے اور میدان عمل کی اسکی اپنی ترجیحات ہیں یہ ترجیحات منزل من اللہ نہیں ہیں کہ اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے۔ بعض علماء نے جماعت کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ مناسب لفظوں میں دائرہ عمل پر تنقید بھی کی ہے اور جماعت کے ذمہ داروں کی توجہ اس طرف مبذول کی ہے کہ زندگی اور مسائل سے قطع تعلق کر لینا اور ملی اجتماعی کاموں سے پہلو تہی مناسب نہیں۔ تبلیغی جماعت کا دائرہ عمل جو کچھ بھی ہو لیکن کم از کم اس کے اکابر کے ذہن میں یہ کبھی نہیں پیدا ہوئی کہ وہ جہاد بالسیف کا یا خلافت و امامت کی دینی اہمیت کا انکار کر دیں۔ تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاسؒ کے ایما پر ان کے رفیق کار مولانا احتشام الحسن صاحب نے "مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اس کتاب میں درج ذیل عبارت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جامع تصور دین اس جماعت کے اکابر کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا:

> "اگرچہ آیت جہاد (سورہ نساء ۹۵-۹۶) میں جہاد سے مراد کفار کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا ہے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو اور کفر و شرک مغلوب و مقہور ہو لیکن بدقسمتی سے آج ہم اس سعادت عظمیٰ سے محروم ہیں۔ تو اس مقصد کے لئے جس قدر جدوجہد ہماری مقدرت و استطاعت میں ہے اس میں تو ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہیئے۔ پھر ہماری یہی معمولی حرکت و عمل اور جدوجہد ہمیں کشاں کشاں آگے بڑھائے گی۔"
>
> (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج)

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مولانا الیاسؒ کے دست راست اور رفیق کار تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے جب ہریجنوں کے اجتماعی تبدیلی مذہب کا اعلان کیا تو مولانا الیاسؒ نے آپ کو حکم دیا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے ملاقات کریں اور انہیں اسلام کی دعوت دیں چنانچہ مولانا احتشام الحسن صاحب گئے اور ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کی اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔

(تذکرہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی ص ۳۱)

یہ واقعہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ تبلیغی کام کے بانیوں کے نزدیک غیر مسلموں میں دعوت کا کام

بھی ضروری کام تھا اور وہ نہ صرف اس کام کی اہمیت سے واقف تھے بلکہ اسے انجام بھی دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تبلیغی کام کی عام ترتیب ہی مقدس بن گئی۔ جو چیزیں کہ ذریعہ اور وسیلہ تھیں اور طریقہ کار کا درجہ رکھتی تھیں اور جن میں ہمیشہ تبدیلی کی گنجائش تھی ناقابل تغیر سمجھ لی گئیں۔ یہاں تک کہ تعلیم کے لئے "تبلیغی نصاب" میں بھی کسی اضافہ اور تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

تبلیغی کام سے وابستہ خواص جو ہندوستان میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں وہ کم از کم تفسیر، حدیث اور سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے دینی کتابوں کا ایک نصاب تیار ہو سکتا ہے۔ اگر وہ زہد و عبادت اور خدا ترسی کی صفات کے ساتھ حکمت اور خدمت کے ساتھ غیر مسلموں سے دعوتی روابط پیدا کریں تو اس کے بہترین نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن عوام تو عوام ہیں خواص کی بھی ان کاموں کی طرف توجہ نہیں ہے اس انتظار میں کہ پہلے ہر مسلمان کو پکا اور سچا مسلمان بنا لیا جائے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو آخرت کے عذاب میں مبتلا ہونے کے لئے چھوڑ دینا کسی درجہ میں بھی عقلی بات نہیں ہے۔

اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں کہ تبلیغی کام کی خدمات بہت ہی مہتم بالشان ہیں عبادت کے داخلی تقاضوں کو سیکھنے اور ایمان و یقین کی حلاوت پیدا کرنے کے لئے یہ ایک بہترین تربیت گاہ ہے لیکن عبادت کے جو خارجی تقاضے ہیں جن کا تعلق خلافت اور تمکین فی الارض سے ہے اور جن کی دینی اور شرعی اہمیت ہے اس کے لئے فکر امروز اور اندیشہ فردا کے ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہے اور جماعت اسلامی اس ضرورت کو بہتر طور پر پورا کرتی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کی خصوصیات کو اپنے اندر جمع کر لیں کہ وہی قرآن کے مطلوب انسان ہیں اور صرف وہی دین کے صحیح معیار پر پورے اترتے ہیں۔

تبلیغی جماعت کے اکابر نے دین کے تصور پر کوئی کتاب نہیں لکھی ہے، جو معرض بحث اور موضوع سخن بنے لیکن اس جماعت کے بانیوں کا روحانی رشتہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادہ سے ہے جن کے ذہن میں دین و سیاست کی تقسیم نہیں تھی۔ مولانا الیاسؒ کا ایک ملفوظ مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کی کتاب کاروان زندگی سے نقل کیا جا رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جہاد کی عظمت مجاہدین کا

احترام اور دین و سیاست کا صحیح رشتہ ان کے فکر و تصور میں موجود تھا:

"مولانا نے غالباً اسی قیام کے زمانہ میں فرمایا کہ مولانا میں نے آپ کی کتاب (سیرت سید احمد شہید) پڑھی۔ لیکن اس سے میری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ میں اپنے خاندان کی بیبیوں اور بزرگوں سے اس سے زیادہ سن چکا ہوں بات سے بات یاد آتی ہے۔ ایک مرتبہ میں مسجد کے بالائی حصہ میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں صاحبزادہ گرامی مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام رہتا تھا مولانا چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے۔ میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ مولانا ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ میں ہیں۔"

(کاروانِ زندگی حصہ اول ص ۲۸۱)

جماعتوں کا سو فیصد متوازن ہونا دشوار کام

توازن کی تلاش میں اگر شخصیات میں یا جماعتوں میں سو فیصدی توازن کہیں نظر نہ آئے تو ملول اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ سو فیصدی اعتدال صرف انبیائی کام کی خصوصیت ہوتی ہے۔ عام انسان تو ناقص ہے اس لئے اس کا انجام دیا ہوا ہر کام ناقص ہوتا ہے اب ان ناقص کاموں کے ذریعہ ہی قیامت تک دین کی خدمت ہوتی رہے گی۔ ایک جماعت ایک پہلو کو لے کر اٹھے گی اور دوسری جماعت کام کے دوسرے پہلو کو سنبھالے گی۔ اگر باہمی اتحاد اور اعتماد موجود ہے تو مختلف جماعتوں اور کاموں سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ توازن کیا ہے؟ مزاج اسلام کیا ہے؟ نظام دین کیا ہے؟ یہ باتیں نظر میں رہنی چاہئیں تاکہ اعتدال و توازن کا معیار سامنے رہے اور دوسرے کاموں کو انجام دینے والوں کا احترام دلوں میں رہے اور ان کے ساتھ تعاون بھی ہوتا رہے۔

کسی جماعت کا پورے طور پر متوازن ہونا خاص طور پر اس اعتبار سے کہ دین کے تمام پہلوؤں کو اس توازن کے ساتھ لے کر چلے جس کا نمونہ سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے دشوار کام ہے۔ تمام پہلوؤں کو ایک ساتھ لے کر چلنے میں کبھی مقامی سیاسی مصلحتیں حائل ہوتی ہیں۔ کبھی کسی جماعت کے بانی کا زور قلم ذہن سازی میں سب سے زیادہ مؤثر عامل

بن جاتا ہے کبھی تحریک کے اولین قائد کا مقامی ماحول اور مخصوص انداز تربیت لوگوں کو ایک خاص رخ پہ لے چلتا ہے۔ ہر شخص دین کے مصادر اور ائمہ سلف کی تحریروں سے براہ راست استفادہ کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ ایک عام آدمی کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا ہے اس تقلید میں کوئی حرج بھی نہیں البتہ جماعت کے قائدوں کی یہ ذمہ داری ضرور ہے کہ صرف اپنے کام اور نہج کو حرف آخر نہ سمجھیں اور دین کے تمام پہلوؤں کو صحیح ترتیب اور توازن کے ساتھ اپنے ذہن میں رکھیں اور دوسرے پہلوؤں پر کام کرنے والے اشخاص اور جماعتوں کی قدردانی ہی نہیں بلکہ ان کی ہمت افزائی اور تائید کریں اگر تنقید کی ناگزیر ضرورت پیش آئے تو شرافت زبان اور شرافت قلم کا پاس و لحاظ رکھیں۔

ایک خلا جسے پر کیا جانا چاہئے

بیسویں صدی کو عمر کے پیمانہ سے ناپا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کا عالم پیری ہے اور اس کی عمر کا آفتاب لب بام آچکا ہے۔ گذشتہ ایک سو سال کی مدت کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھیں گے یہ عہد مسلمانوں کے لئے بہت پرآشوب رہا ہے لیکن اس پرآشوب عہد میں مسلمانوں کی بڑی قدآور شخصیتیں پیدا ہوئیں اور اسلامی علوم و فنون کے ماہرین اور کاملین نمودار ہوئے۔ بیسویں صدی کا آفتاب طلوع ہوا تو یہ مسلمانوں کی نکبت و ناسازگاری کا زمانہ تھا۔ حکومت ہاتھ سے جا چکی تھی۔ زبان و تہذیب کا مستقبل خطرہ میں تھا، معیشت پر زوال آچکا تھا۔ شدھی سنگٹن کی تحریک شروع ہو رہی تھی، مسلمانوں کو مختلف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سامنا تھا: مغربی تہذیب کا امنڈتا ہوا سیلاب ان سب پر مستزاد تھا۔ جان و مال اور عزت و آبرو ہر چیز داؤں پر لگ چکی تھی۔ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی مسلمانوں کی ہمہ گیر تحریکیں اٹھیں اور بڑی اہم شخصیتیں سامنے آئیں جنہوں نے مسلمانوں کے دینی سرمایہ کی حفاظت کی، اسلامی تشخص کا دفاع کیا اور مسلمانوں کو عصری تعلیم سے بھی آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ اس صدی میں ملت اسلامیہ کی تاریخ کے آسمان پر جگمگاتے ہوئے ناموں کی ایک کہکشاں ہے اور ان میں ہر ایک نام قابل افتخار اور لائق اعتبار ہے۔

لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ایک پوری صدی ختم ہو گئی لیکن مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی دعوتی

تحریک نہیں اٹھ سکی جس نے غیر مسلموں کو دعوت کا نشانہ بنایا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دعوت و تبلیغ کا مفہوم بس اس قدر باقی رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کو جمع کر کے ان کو دینی وعظ سنا دیا جائے یا ان کے لئے اصلاح و تربیت کا لٹریچر تیار کر دیا جائے حالانکہ انبیاء کرام کے حالات کا اور سیرت نبوی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کافروں اور مشرکوں اور بت پرستوں تک خدائے واحد کی عبادت کا پیغام پہنچانا ان کا اصل مشن تھا۔ انہوں نے اس پیغام کے قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت بھی کی اور تزکیہ نفس کا بھی کام کیا لیکن ان کی کوششوں کا اصل محور اصنام پرستی کی مخالفت اور دین توحید کی طرف دعوت تھی۔ اس صدی میں مسلمانوں کے مشائخ اور اہل دین نے ہر چھوٹی اور بڑی سنت کو زندہ کرنے کی تلقین کی اور بجا طور پر کی لیکن غیر مسلموں کو دعوت دینے کی سب سے بڑی سنت مردہ اور متروک رہی۔

اس غفلت کی توجیہ کے لئے گردوپیش میں پھیلی ہوئی حساسیت کا عذر بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ حساسیت پیغمبروں کے زمانہ میں آج کے زمانہ سے زیادہ موجود تھی اور دعوت کے جرم عشق کی تعزیریں بھی کئی گنا زیادہ سخت تھیں۔ خود مسلمانوں کی بے عملی اور غلط کاری کو بھی عذر کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن ہر جگہ مسلمانوں میں نیک کردار لوگ موجود ہیں جو دعوت کے کام کا آغاز کر سکتے ہیں اور اس متروک سنت کو زندہ کر سکتے ہیں۔

کام کا آغاز اپنے گردوپیش اور تعلقات کے دائرہ سے شروع کرنا چاہئے۔ خدمت اور حسن سلوک کے ذریعہ دلوں کو جیتنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ روحانیت اور تزکیہ نفس کے ذریعہ جس کا نام احسان یا سلوک ہے زبان و تقریر میں تاثیر پیدا کرنی چاہئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں صوفیاء کرام نے اس سے بڑا کام لیا ہے۔ غیر مسلم احباب کو اسلام کے بارے میں اور سیرت کے بارے میں اچھی کتابوں کا تحفہ پیش کرنا چاہئے۔ دعوت کے اس کام کے لئے اسلامی علوم و فنون میں بڑی مہارت کی ضرورت نہیں ہے البتہ دعوت کے کام کی اہمیت کے احساس کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں دینی تعلیم کا میدان ہو یا عصری تعلیم کا دونوں میں قد آور اور عہد ساز شخصیتیں اٹھیں جنہوں نے اپنے اپنے مشن کی تبلیغ کی اور لاکھوں انسانوں کو متوجہ کیا لیکن غیر مسلموں تک حق کا پیغام پہنچانے کے لئے کوئی عہد ساز شخصیت نہیں اٹھ سکی لیکن اس عہد ساز شخصیت

کے انتظار میں بیٹھے رہنا اور کام نہ شروع کرنا مہلک غلطی ہوگی۔ ضرورت ہے کہ منظم طریقے سے اس کام کو شروع کر دیا جائے اور ہر ریاست اور ضلع کو یونٹ بنا دیا جائے اور ہر جگہ کچھ درجن افراد ہوں جو اپنے خلوص اور اپنے وقار اور اپنی ہمدردی سے لوگوں پر اثر انداز ہوں اور دین حق کا پیغام پہنچائیں۔ مسلمانوں کی بے شمار تنظیمیں ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر مفید کام انجام دے رہی ہیں۔ لیکن یہ ایک خلا ہے جسے جلد سے جلد پُر کرنے کی ضرورت ہے۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز

توازن کی تلاش کے لئے سفر کے دوران مختلف اشخاص اور جماعتوں سے گزر کر اب نظر ایسی شخصیت پر آ کر رکتی ہے جس نے اس دور میں پورے عالم اسلام کی دینی تحریکوں اور کاموں کی سرپرستی کی ہے اس کا نام کسی جماعت سے وابستہ نہیں لیکن ہر دینی کوشش میں اس کی شخصیت روح رواں اور قلب تپاں کی ہے۔ ہر حلقہ میں اس کی شخصیت محترم اور مسلم ہے۔ اس کی ذات میں سوز یقین بھی ہے اور عزم جنوں بھی، فکر امروز بھی اور اندیشہ فردا بھی۔ تبلیغی کام کے اکابر کا ذکر و عبادت اور سنتوں کا اہتمام بھی اور جماعت اسلامی کی فکری اور ادبی کاوش اور علم الکلام بھی جو سوئے گردوں نالہ شب گیر کو سفیر بنا کر بھیجتا ہے جو آسمان کے تاروں کو اپنی محبت کا راز داں بناتا ہے جس کا دل اور جس کی زبان ہر وقت ذکر کی لذت سے آشنا ہے اور جس کے دل میں پوری انسانیت کا درد ہے اور جس نے ملک والوں کو پیام انسانیت کا درس دیا ہے۔ تزکیہ نفس مدارس اور دینی تعلیم کی سرپرستی سے لے کر ہر اجتماعی ملی اور تعمیری خدمت اور علم و ادب، تصنیف و تالیف، تحریک و دعوت اور حفاظت ملت کے تمام کام جس کی ذات سے وابستہ ہو گئے ہیں اور وہ خود ان سے وابستہ ہے۔ صرف ملک کے اندر نہیں بلکہ بیرون ملک بھی جس کا نام خدمت دین کا عنوان بن گیا ہے۔ پورے عالم اسلام کی ادبی اسلامی تحریک جس کے زیر سایہ پروان چڑھ رہی ہے اور عرب علماء و ادباء جس کی تحریروں کو حرز جان بناتے ہیں۔ ملکوں کے فرماں روا بھی جس کا احترام کرتے ہیں اور وہ خود درویشانہ اور فقیرانہ زندگی گذارتا ہے جسے فیصل ایوارڈ دیا گیا تو اس نے اس کا نصف جہاد افغانستان

کے لئے دے دیا اور نصف اُسی ملک کے اندر تقسیم کر دیا۔ جس کی شخصیت کی جامعیت تصنیفات اور کاموں کے تنوع اور ان سب کے ساتھ اخلاص بذاہدانہ زندگی کو دیکھ کر مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسی شخصیتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ شخصیت ہے اس دور میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی۔ مردِ مومن کی جامعیت کا نمونہ، دین کے متوازن تصور کی تصویر۔ جامعیت کا مکمل اور اکمل نمونہ صحابہ کرام تھے جن کی توصیف رات کے عبادت گذار اور دن کے شہسوار۔ رہبان باللیل و فرسان بالنہار کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ اقبال نے مومن کی ہشت پہل شخصیت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا دکار ساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولی صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطہ پرکار حق مرد مسلماں کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

علماء اور دانشوروں کے تاثرات

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی سابق استاذ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کی رائے

ڈاکٹر محسن عثمانی کا مقالہ "دین کا متوازن تصور۔ عبادت و خلافت کی جامعیت" ایک کتابچہ کی شکل میں مجھے ملا، میں نے اس کو دلچسپی سے اور بغور پڑھا اور طبیعت خود آمادہ ہوئی کہ اس پر اپنے تاثرات قلم بند کروں۔

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی (استاذ عربی لٹریچر دہلی یونیورسٹی) ہمارے معاصر اصحاب علم و قلم کی صف میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، ان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کا علمی احاطہ کر لیتے ہیں اور سمجھانے سے پہلے خود سمجھ لیتے ہیں اور ان کا انداز بیان ان کے مزاج کی طرح متوازن اور غیر جارحانہ ہے۔ وہ سخت سے سخت بات کو نرم سے نرم لہجے میں کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ جب کسی برخود غلط اور بقلم خود مصلح و مفکر کے زخم افکار پر نشتر لگاتے ہیں تو اپنے نوک قلم سے فاسد مواد کو نکال کر دکھا دیتے ہیں اور نشتر بھی بہت احتیاط سے لگاتے ہیں جس کو دیکھ کر صاف نظر آتا ہے ان کو مریض سے کوئی ذاتی عداوت یا نفرت نہیں ہے، ان کو نفرت اس کے مرض سے ہے۔ وہ مرض کے جراثیم سے اہل نظر کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ یہ متعدی ہو کر طاغوتی شکل نہ اختیار کرے مگر مریض کا نام بھی نہیں لیتے، اس کی تشہیر یا اس کو رسوا سر بازار کرنا ان کا ہدف نہیں ہوتا۔ "العلم بالشیٔ للتحذر منہ" پر ان کا عمل رہتا ہے یعنی بعض چیزوں سے واقفیت اس لئے کی جاتی ہے تاکہ ان کے مہلک اثرات سے بچتے رہیں۔

اس مقالہ میں ڈاکٹر عثمانی نے اپنے مخصوص علمی اور پروقار انداز میں دین کے طریق وسط کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ہر طرف، انتہا پسندی کی خرابیاں اور غلطیاں خود بخود نمایاں ہو جاتی ہیں۔

مولانا شاہ طیب عثمانی ندوی کی رائے

مقالہ" دین کا متوازن تصور" پیش نظر ہے۔ عرصے کے بعد اپنے موضوع پر ایک قابل قدر علمی کوشش سامنے آئی ہے۔ یہ مقالہ جو کتابی شکل میں ہے مثبت فکر اور معروضی انداز نظر کا آئینہ دار ہے۔ جس میں کتاب وسنت کی روشنی میں خالص علمی دلائل وبراہین کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے اور دین و سیاست، عبادت وریاضت، جہاد واحتساب خلافت کا تصور اور اسلامی خلافت کے تسلسل جیسے نازک مسئلہ پر بڑی احتیاط اور تفقہ کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے جو صاحب مقالہ کی اس موضوع پر دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا ثبوت ہے۔ یہی مثبت فکر اور معروضی انداز بیان اس مقالہ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

دور صحابہ، تبع تابعین سے لے کر آج تک علمائے متقدمین ومتأخرین اور مصلحین امت کی تمام تر احیائے دین کی کوششیں چاہے وہ جس شکل وانداز میں ہوں کتاب وسنت کی روشنی میں دین وسیاست اور عبادت وخلافت کی جامعیت کا ایک سلسلۃ الذہب رہی ہیں۔ دور جدید میں عالم عرب کی تحریک الاخوان المسلمون اور برصغیر ہند کی تحریک اسلامی اس کی نمایاں مثال ہیں۔

مقالہ کے آخری حصہ میں برصغیر ہند کی مختلف دینی تحریکوں اور دینی اداروں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ بھی مناسب ہے جس سے صاحب مقالہ کے دینی جذبہ اعتدال اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا ظفیر الدین مفتاحی مفتی دارالعلوم دیوبند کی رائے

" میں نے آپ کے مضامین پڑھے۔ ماشاء اللہ آپ نے بڑی محنت کی ہے اور عمدہ مقالہ لکھا ہے۔ آپ کا نقطۂ نظر بالکل صحیح اور کتاب وسنت کے مطابق ہے اور مخالف کے سامنے حقیقت کھول کر رکھ دی ہے امید ہے کہ وہ آپ کے مقالہ پر ایمان لے آئیں گے لیکن اگر وہ ..... صاحب ہیں جیسا کہ میرا اندازہ ہے تو وہ تو بہت پہلے سے ذہنی ارتداد کے بھنور میں گرفتار ہیں اپنی بات سے شاید نہیں پھریں گے۔ بہرحال آپ نے خیر خواہی کا حق ادا کر دیا

/

ہے اپنی طرف سے بھی اور ملت اسلامیہ کی طرف سے بھی۔ آپ ہم سب کی طرف سے لائق مبارکباد ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس خیر خواہی کو قبول فرمائے اور اجر جزیل سے نوازے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی کی رائے

"رمضان المبارک کی نورانی فرصت میں آپ کا نہایت جامع اور مکمل مضمون بغور پڑھا۔ مضمون میں قابل تعریف اعتدال ہے۔ دونوں پہلوؤں کا مضمون نگار کو مکمل فہم حاصل ہے آپ نے درست لکھا ہے کہ دین و سیاست کا رشتہ بہت نازک ہے لیکن اصل میں فی نفسہٖ اس میں نزاکت نہیں معلوم ہوتی بلکہ طرفین کے غلو اور جدید اصطلاحوں پر زور دینے سے یہ نزاکت پیدا ہو گئی ہے۔ بات وہی صاف ہے جو امام ابن تیمیہؒ نے لکھی ہے کتنی سیدھی اور واضح ہے۔ منکرات کی روک تھام طاقت و حکومت کے بغیر ممکن نہیں اسی لئے حدیث مشہور میں "تغییر بالید"، کو مقدم رکھا گیا ہے نہی عن المنکر مقصود بالذات ہے اور اس کے لئے طاقت کا حصول مقصود بالواسطہ ہے۔ اس مقصود ثانی کے لئے حسب احوال و ظروف جدوجہد فرض ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کا یہ فقرہ غالباً حضرت عثمان غنیؓ سے منقول ہے کتنی مختصر اور جامع بات ہے "ان اللہ یزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن" اس فقرہ میں ادباً یا تحقیقاً دفاع کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے ورنہ یہ قانون فطرت ہے۔ برائیوں کا دفاع طاقت سے ہوتا ہے صرف قانون سے نہیں ہوتا۔

حضرت سید صاحب (علامہ سید سلیمان ندویؒ) نے وجہ اطمینان اور سکون خاطر اور نعمت کے الفاظ بہت ہلکے تحریر فرمائے ہیں اور یہ ہلکا پن مودودی صاحبؒ کی انتہا پسندانہ تعبیرات کا رد عمل تھا۔ اصل میں اس معاملہ میں عمل اور رد عمل کا سلسلہ شروع ہی سے جاری ہے۔

منکرات کے دفاع کے لئے اہل حق نے مسلم حکومتوں کا سامنا کیا اور ان کے جابرانہ طرز عمل سے ناامید اور بددل ہو کر فرد کی اصلاح کا کام سنبھال لیا۔ شروع میں اپنے آپ کو غیر مکلف کہا گیا ٹھیک ہے پھر اس حالت پر قانع ہو گئے یہ غلط تھا۔ پچھلے پچاس سالہ دور کی اسلامی تحریکوں نے قناعت کے تصور کو توڑا اور دین کے اجتماعی پہلو کو جو بہت زیادہ دب گیا تھا

اسے ابھارا۔ شاہ ولی اللہؒ اس تحریک کے امام ہیں اپنی صدی کے اور ہمارے دور کے۔
ان اجتماعی تحریکوں میں بھی فطری طور پر غلو اور انتہا پسندی پیدا ہوئی اور ہندوستان کی اسلامی تحریک کے قائدین کی انتہا پسندی اس وقت ٹوٹی جب جماعت اسلامی پاکستان کے مسلم دولٹوں سے محروم ہونے لگی تب احساس ہوا کہ افراد کی تیاری کے بغیر یہ جہاد کیسا؟
ہمارے اکابر نے مودودی صاحب کی تحریک پر جو تنقیدیں کیں ان میں بھی اسلوب اور پیرایہ بیان کا تشدد پیدا ہو گیا مثلاً حضرت ۔۔۔ کا یہ سادہ اور قصباتی محاورہ کہ حکومت الٰہیہ کا قیام شیخ چلی کا خواب ہے کیوں کہ ۔۔۔۔ والے تبلیغ کی تحریک کو دین کی ناقص اور غیر مکمل تبلیغ کہتے ہیں پھر اس کا جواب اس کے سوا کیا تھا؟
مولانا ۔۔۔ نے شروع میں مولانا ۔۔۔۔۔ کے غلو اور انتہا پسندی کو توڑنے کی کوشش کی یہ الگ بات ہے کہ اب وہ خود انتہا پسندی کا شکار ہیں اور ان کے اندر اسلامی قائدین کے خلاف ذاتی حسد و رقابت کے جذبات نے جنم لے لیا ہے۔
بہر حال آپ نے اس مسئلہ کو سلامت روی سے حل کیا ہے۔"

مولانا انظر شاہ کشمیری استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم دیوبند (وقف)

"۔۔۔۔ نے اپنے لٹریچر میں مصلحت حکمت کو اس درجہ غالب کیا کہ پوری شریعت پہ اسے حاوی کر دیا۔ ان کی ہر تحریر کا مرکزی نقطہ مسلمانوں کو مقاومت سے محروم کر دینا ہے۔ ہندوستان کے ہر فساد میں انہیں مسلمانوں ہی کی غلطی نظر آتی ہے۔ ہر اسلامی تحریک میں انہیں اسقام نظر آتے ہیں۔ دین کی جس طرح سے وہ تشریح کر رہے ہیں وہ اسلاف کے متفقہ نقطۂ نظر کے واقعتاً مخالف ہے۔ یہ شخص امت کو حشیش دے رہا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔"

ڈاکٹر سید عبد الباری سلطان پوری کی رائے

"آپ کا مقالہ بہت پسند آیا۔ آپ نے اپنی روشن ضمیری، علمی وزن اور ذہن و مزاج کے

غیر معمولی توازن کا غیر معمولی اظہار فرمایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جماعت کے لوگوں کو بڑی حکمت سے
ان کی موجودہ کوتاہیوں کی طرف متوجہ کیا ہے اور مختلف جماعتوں میں حریفانہ کشمکش کو بھی
ختم کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ آپ نے مسکت دلائل کے ذریعہ اسلامی نقطۂ نظر کو پیش فرمایا
ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے فتنہ کو رفع کرنے میں آپ نے جو تاریخی رول ادا کیا ہے خدا اس کے
لئے جزائے خیر دے۔ آپ کی تحریروں پر کتنے دلوں سے دعائیں نکلی ہیں آپ اس کا اندازہ
نہیں کر سکتے۔

پروفیسر عبد المغنی وائس چانسلر متھلا یونیورسٹی کی رائے

میں نے آپ کے مضامین بہت دلچسپی سے پڑھے۔ غالباً آپ نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی ان
باتوں کا جواب دیا ہے جو وہ ایک مدت سے دین اسلام کی فکری تحریف کے طور پر کرتے
آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا جواب مدلل و مؤثر اور کافی ہے اس سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور
ان کے ہم خیالوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ مجھے آپ کے مضامین پسند آئے اگر آپ انہیں
کتابی شکل میں شائع کریں تو یہ حق وصداقت کی تبلیغ ہوگی۔

جناب وحید الدین سلیم (حیدر آباد) کی رائے

آپ کے مضامین موضوع پر بہت خوب ہیں لیکن کہیں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا نام نہیں پایا
گیا حالانکہ ان کے اور ان کے رسالے کے مکمل حوالہ کے ساتھ ان پر تنقید کی جانی چاہیے تھی۔
جو لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو پڑھ چکے ہیں وہ تو بآسانی مدعا سمجھ جائیں گے لیکن نئے لوگوں کو دشواری
پیش آسکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دام ہم رنگ زمین ہیں ان کو بے نقاب کیا جانا بہت ضروری
ہے۔ امت کے اندر رہ کر جو شخصیتیں اس کے چوکھٹے کو توڑنے کی سعی ناکام میں مصروف ہیں
ان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ برتی جانی چاہیئے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے لوگ مذہب
کا بہترین پوسٹر دکھائی دیتے ہیں اور تلاش کیا جائے تو ان کے خون میں مذہب کی تھوڑی سی
مقدار بھی نہ مل سکے گی ایسے لوگ چاہے کتنے ہی کثیر وسائل سے لیس ہوں روح امت ان
کی کرتب بازیوں کو ہرگز قبول نہ کر سکے گی۔